حصہ سوم

آیت اللہ سید جعفر مرتضیٰ عاملی مدظلہ العالی

احسن الجوابات

جلد سوم

از قلم

آیت اللہ جعفر مرتضیٰ عاملی، لبنان

مترجم

حجۃ الاسلام علامہ اطاف حسین کلاچی

پیش کش

حجۃ الاسلام علامہ ریاض حسین جعفری فاضل قم

ناشر

ادارہ منہاج الصالحین

جناح ٹاؤن ٹھوکر نیاز بیگ لاہور فون: 35425372

کتاب	:	احسن الجوابات (جلد سوم)
از قلم	:	آیت اللہ جعفر مرتضیٰ عاملی، لبنان
مترجم	:	حجۃ الاسلام علامہ الطاف حسین کلاچی
نظر ثانی	:	حجۃ الاسلام علامہ ریاض حسین جعفری فاضل قم
پروف ریڈنگ	:	شیر محمد عابد مولائی - محمد عمران حیدر جعفری
فنی تعاون	:	زہراء بتول جعفری، محدثہ بتول جعفری
اشاعت	:	مارچ 2011ء
صفحات	:	160
ہدیہ	:	[illegible] روپے

ملنے کا پتہ

ادارہ منہاج الصالحین۔ لاہور

الحمد مارکیٹ فسٹ فلور دکان نمبر 20۔ غزنی سٹریٹ۔ اُردو بازار۔ لاہور

فون: 042-37225252 ، 0301-4575120
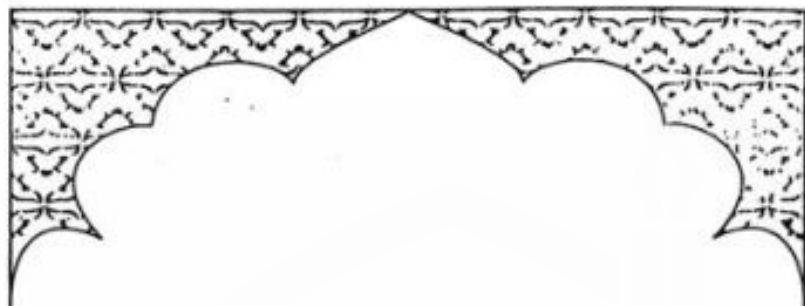
احسن الجوابات

جلد سوم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ترتیب

O......OOO......O

عرض مترجم

''احسن الجوابات'' کا تیسرا حصّہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ آیت اللہ السید جعفر مرتضٰی عاملی جن کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ اس وقت دنیا میں ایک بہت بڑے محقق کے نام سے متعارف ہیں۔ ان پر دنیا بھر سے جو سوالات ہوئے ہیں انھوں نے ان مشکل ترین سوالات کے جوابات احسن انداز میں دیے ہیں۔ یہ ان جوابات کا مجموعہ چودہ حصوں پر مشتمل ہے۔

حجۃ الاسلام علامہ ریاض حسین جعفری قبلہ جنھوں نے اپنے آپ کو علمی دنیا کے لیے وقف کر رکھا ہے۔ جو ہر آئے دن اس کوشش میں رہتے ہیں کہ پاکستانی عوام تک تعلیماتِ آلِ محمدؑ کا پیغام پہنچے۔ موصوف اس وقت سیکڑوں کتب شائع کر چکے ہیں۔ خداوند ان کی سعی جمیلہ کو قبول فرمائے اور ان کی توفیقاتِ خیر میں اضافہ فرمائے۔ دین اسلام کی تبلیغات کے لیے دن رات مصروف ہیں۔

حجۃ الاسلام علامہ محمد حسن جعفری صاحب قبلہ نے ''احسن الجوابات'' کے پہلے حصّہ کا ترجمہ کیا تھا۔ موصوف کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ ان کی اس وقت پچاس سے زائد کتب مارکیٹ میں آچکی ہیں۔ خداوند تعالیٰ ان کی توفیقات میں مزید اضافہ فرمائے۔

''احسن الجوابات'' کے دوسرے حصّہ کا ترجمہ اس حقیر نے کیا تھا۔ اب تیسرا حصّہ بھی آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ علمی کام ایک مشکل ترین کام ہے۔ اس کے حصول کے لیے دن رات ایک کرنا پڑتا ہے۔ علم جتنا بڑھتا ہے اُسی مقدار میں انسان پر کائنات روشن ہو جاتی ہے۔ اُسی انداز میں انسان کی عظمت بڑھتی ہے۔

حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام کا عظیم الشان فرمان ہے، آپؑ نے فرمایا:

فَاِنَّ قِیْمَۃَ کُلِّ اِمْرَءٍ مَا یَعْلَمُ

"ہر انسان کی اتنی ہی قیمت ہے جتنا اس کا علم ہے"۔

امامِ کائناتؑ کے بارے میں اس دور کے علما کبار نے کہا ہے:

یَتَفَجَّرُ الْعِلْمُ مِنْ جَوَانِبِہٖ وَتَنْطِقُ الْحِکْمَۃُ مِنْ نَوَاحِیْہِ
یَسْتَوْحِشُ مِنَ الدُّنْیَا وَزَھْرَتِھَا وَیَسْتَاْنِسُ بِاللَّیْلِ وَظُلْمَتِہٖ

"ان کی رگ رگ سے علم کے چشمے پھوٹتے تھے۔ ان کی ہر بات میں حکمت و دانش کے دریا پنہاں تھے۔

آپؑ اس دنیا میں رہتے ہوئے اس دنیا کی لذات سے دور بہت دور تھے۔ اپنے پروردگار سے ملاقات کی تڑپ نے انھیں رات کی تاریکیوں سے مانوس کر رکھا تھا"۔

وہ بابِ علم تھے، انھوں نے جب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے علم کے ہزار باب سیکھے تو ہر باب سے ہزار ہزار ابواب اپنے اُوپر اور کھول لیے تھے۔ خوشا قسمت ہیں وہ لوگ جو اپنے آقا و مولا سے اس علمی رشتے کی وجہ سے مربوط ہیں۔ جنھوں نے اپنی زندگیاں وقف کر رکھی ہیں۔ محمدؐ و آلِ محمدؐ کی تعلیمات کی ترویج و تبلیغ کے لیے اپنی زندگی کا کوئی لمحہ بیکار نہیں جانے دیتے۔

یہی وہ علمائے کرام ہیں، جن کے دم سے روشنی ہے۔ جن کے وجود سے حق کا کلمہ بلند ہوتا ہے اور حلال وحرام کی تمیز ہوتی ہے۔

خداوند متعال کی بارگاہ میں دعا ہے کہ بزرگانِ دین جو مرحوم ہو چکے ہیں، ان کے درجات بلند فرمائے اور وہ جو اس دور میں حق کا دفاع کر رہے ہیں، ان کا سایہ ہم پر ہمیشہ باقی رکھے۔

الطاف کلاچی

تقدیم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

والحمد للہ والصلوٰۃ والسلام علی رسول اللہ محمد و آلہ الطاہرین واللعنۃ علی اعدائھم اجمعین من الاوّلین والآخرین الی قیام یوم الدین

امابعد!

سوال ان احساسات کا دوسرا نام ہے جن کا تعلق ضروریات وحوائج سے ہوتا ہے۔ جس کے حصول کے لیے انسان بے تاب ہوجاتا ہے۔ جب تک سوال کا جواب حاصل نہ ہو، اس کے وجدان کو سکون نہیں ملتا۔ وہ اس مریض کی طرح نظر آتا ہے، جس کو مرض نے نڈھال کر رکھا ہو تو اُسے علاج ودوا کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح ایک سائل کی حالت ہوتی ہے، جب اُسے جواب ملتا ہے تو وہ جواب اس کے وجدان کے لیے دوا کا اثر رکھتا ہے۔

مجھ پر ہر طرف سے سوالات ہوتے رہتے ہیں جو شمار سے باہر ہیں۔ ہمیشہ میری کوشش رہی ہے کہ ان سوالات کے شافی اور کافی جواب دوں لیکن میں نے ہمیشہ اختصار کو مدنظر رکھا ہے۔ علاوہ اپنی کم مائیگی کا بھی اعتراف ہے۔

میرے محترم قارئین کو کہیں کوئی خطا نظر آئے تو میری تصحیح فرمادیں۔ میں ان کا شکرگزار ہوں گا۔ خداوند تعالیٰ ہمیں ہر قسم کے زلل وخلل سے محفوظ رکھے۔

والحمد للہ رب العالمین

سید جعفر مرتضیٰ عاملی، لبنان

پہلا حصہ

عقائد

کلمہ توحید کی قیمت

سوال توحید صدوق میں حدیث ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''لا الٰہ الا اللہ'' وہ کلمہ توحید ہے جو مجھ سے قبل یہ کسی زبان پر جاری نہیں ہوا''۔ اس حدیث کی تشریح فرمائیں۔ اس فرمان کا مقصد کیا ہے؟

جواب اس کلمہ شریفہ کی اہمیت بتلائی گئی ہے کہ یہ کلمہ کتنا عظیم ہے جو انسان کی زبان پر جاری ہوتا ہے۔ اس کلمہ سے توحید خالص کا اقرار ہوتا ہے اور اس سے شرک کی نفی ہوتی ہے۔ یہ کلمہ حیاتِ انسانی کی بنیاد ہے۔ اس کی فکر اس کے ایمان اور اس کے موقف کا ترجمان ہے۔ یہ کلمہ اللہ تعالیٰ کا قلعہ ہے اور جنت کی قیمت ہے۔

یہ وہ کلمہ ہے جو ہر کلمہ پر بھاری ہے، جو اپنی نظیر نہیں رکھتا اور ہر عبادت سے افضل ہے۔ جناب شیخ صدوقؒ نے اپنی کتاب ''ثواب الاعمال میں اس کلمہ کی تفصیل پیش کی ہے۔

اسمائے حسنیٰ

سوال ① کیا اسمائے حسنیٰ ایک سو ہیں۔ ہم صرف ننانوے کو جانتے ہیں؟

② اگر ہم ننانوے اسماء کے علاوہ باقی جو ایک ہے، کو جان لیں تو

پورے سو ہو جائیں گے؟

۳ تمام مسلمان اسمائے حسنٰی میں متفق کیوں نہیں ہیں؟

۴ کیا ان اسماء کا یاد رکھنا ضروری ہے؟

۵ اگر ضروری ہے تو پھر ترتیب کیا ہے؟

جواب پہلے اور دوسرے سوال کا جواب اسمائے حسنٰی کے عدد کے بارے میں ہے اور ایک جو باقی ہے، اس کے بارے میں ہے۔ جو ننانوے اسماء کے علاوہ اسم ہے وہ اللہ تعالٰی کا اسمِ مبارک ہے اور وہی اسمِ اعظم ہے۔

احادیث میں وارد ہے کہ اللہ تعالٰی کے اسماء ننانوے ہیں۔ جس شخص نے ان اسماء کے ذریعے دعا مانگی اس کی دعا ضرور قبول ہوئی ہے۔ جس نے ان اسماء کا احصاء کیا وہ جنت میں داخل ہوگا۔

جنابِ صدوقؒ کا فرمان ہے: احصاء کا یہاں معنٰی احاطہ ہے یعنی جس آدمی نے ان اسماء سے حصار کیا اور ان اسماء کے مطالب اپنے اُوپر نافذ کیے۔ یہاں احصاء کا معنی تعداد نہیں ہے۔ (بحارالانوار، ج ۴، ص ۱۸۷)

لیکن کتاب عوالی اللئالی میں حدیث بیان ہوئی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ نے فرمایا: خداوند تعالٰی کے چار ہزار اسم ہیں۔ ان چار ہزار اسماء میں سے ایک ہزار اسم کا علم اللہ تعالٰی کے سوا کسی اور کے پاس نہیں ہے۔ اور ایک ہزار کا علم اللہ اور ملائکہ کے پاس ہے۔ ان کے علاوہ کوئی اور نہیں جانتا۔ جو تیسرا ہزار ہے اس کا علم صرف اللہ اور اس کے ملائکہ اور انبیاءؑ کے پاس ہے، کسی اور کے پاس نہیں۔ جو چوتھا ہزار ہے ان ہزار اسماء کو اہلِ ایمان جانتے ہیں۔

یہ جو آخری ہزار اسماء ہیں ان کی تفصیل کچھ اس طرح ہے

تین سو کا ذکر تورات میں ہے، تین سو کا ذکر انجیل میں۔ اور باقی ایک سو کا

ذکر قرآنِ مجید میں ہے۔ ننانوے اسماء ظاہر ہیں اور ان میں سے ایک کو مخفی رکھا گیا ہے۔ جس شخص نے ان اسماء سے احصاء کیا تو وہ ضرور جنت میں داخل ہوگا۔ (بحار الانوار، ج ۴، ص ۲۱۱)

ان اسماء کے بارے کچھ روایات پیش کروں گا۔ (بحار، ج ۴، ص ۱۸۶-۲۱۱)

روایات میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اسم اعظم تہتر حروف ہیں:

جنابِ آصف بن برخیا کے پاس صرف ایک حرف تھا۔ جنابِ عیسیٰؑ کے پاس دو حرف تھے۔ جناب موسیٰؑ کے پاس چار حروف تھے۔ جنابِ ابراہیمؑ کے پاس آٹھ حروف تھے۔ جنابِ نوحؑ کے پاس پندرہ حروف تھے۔ جنابِ آدمؑ کے پاس پچیس حروف تھے۔

حضرت محمد ﷺ کو اور ان کے اہلِ بیتؑ کو بہتر حروف عطا کیے گئے۔ ایک حرف خاص ہے جو اللہ کے پاس ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سوا اُسے کوئی اور نہیں جانتا۔

بعض روایات میں ہے: جنابِ ابراہیمؑ کے پاس چھ حرف تھے اور جنابِ نوحؑ کے پاس آٹھ حرف تھے۔

بصائر الدرجات، ص ۲۰۸-۲۱۱ میں یہ روایات موجود ہیں۔ بحار الانوار، ج ۴، ص ۲۱۰، ۱۱ اور السرائر وغیرہ میں ان روایات کو آپ دیکھ سکتے ہیں۔

(۲)...... اب اس سوال کا جواب کہ اس امر میں مسلمانوں کا اختلاف کیوں ہے۔ اس کا جواب واضح ہے کیونکہ شیعہ اور غیر شیعہ کے مصادر مختلف ہیں، اس لیے اختلاف ہے۔ اہلِ تشیع کے مصادر یہ ہیں: قرآن کریم، حدیث رسولؐ اللہ و آئمہ اہلِ بیت علیہم السلام کیونکہ اہلِ بیت رسولؐ مثلِ سفینۂ نوحؑ ہیں۔ جو اس سفینہ سے مربوط ہوا وہ نجات پا گیا اور جس نے اس کو چھوڑ دیا تو وہ غرق ہوگیا علاوہ ازیں اہلِ بیتؑ ثقلین میں سے ایک ہیں۔

جس نے ثقلین سے تمسک کیا تو وہ کبھی گمراہ نہ ہوگا۔ اہلِ تشیع کے علاوہ دوسرے لوگوں نے اہلِ بیتؑ کے علاوہ دوسرے مصادر بنائے ہیں اس لیے اختلاف واضح ہے۔

③...... آپ کا تیسرا سوال کہ ہم سے اسمائے حسنیٰ کے حفظ کا مطالبہ کیا گیا ہے یا نہیں؟ جی ہاں روایات یہی کچھ بتاتی ہیں لیکن وجوب کی حد تک نہیں بلکہ مستحب ہے ان کے ذکر سے، اور حفظ سے ثواب حاصل ہوتا ہے اور دعائیں قبول ہوتی ہیں۔

④...... آپ نے ان اسماء کی ترتیب کے بارے سوال کیا، احادیث میں کوئی ترتیب نہیں ملتی جس طرح چاہیں پڑھ سکتے ہیں۔

مسئلہ بدا کی وضاحت

سوال: اللہ تعالیٰ کے لیے عقیدہ بدا کا اختیار کرنا۔

بدا کے لغت میں دو معانی ہیں:

①...... ایک مخفی چیز کا ظاہر ہونا، ایک چیز کا واضح صورت میں ظاہر ہونا۔ (مفردات القرآن راغب اصفہانی، ص۱۱۳، قاموس المحیط، فیروز آبادی، ۳۰۲/۴)

قرآن مجید میں سورۂ زمر میں ہے:

وَبَدَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مَا لَمْ يَكُوْنُوْا يَحْتَسِبُوْنَ (۳۹:۴۷)

''اور اللہ کی طرف سے وہ امر ان پر ظاہر ہو کر رہے گا، جس کا انھوں نے خیال بھی نہیں کیا تھا''۔ (تفسیر ابن کثیر، ۵۷/۴)

②...... دوسرا معنی یہ ہے: رائے کا بدل جانا۔ ابن فارس نے کہا ہے: اس امر میں مجھے بدا ہوا، یعنی جو میں رائے پہلے رکھتا تھا اُس میں تبدیلی آ گئی۔ (مقاییس اللغۃ، ۲۱۲/۱)

جوہری نے بدا کے بارے میں لکھا کہ بدا کا معنی ہے: ''اس کے

لیے کسی امر میں بدا ہوا، یعنی ایک نئی رائے پیدا ہوئی۔ (الصحاح، ۱/۷۷)

بدا کے پہلے دو معنی اللہ تعالیٰ کے لیے جائز نہیں ہیں کیونکہ ان معانی کے اختیار کرنے سے اللہ تعالیٰ کے لیے جہل اور حدوثِ علم لازم آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اس امر کا پہلے علم نہ تھا، اب ہوا ہے یا بعد میں ہوا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ ان باتوں سے منزہ ہے۔

ابن اثیر نے کہا: بدا کا معنی کسی شے کا استصواب ہے کہ جس کا علم نہ تھا اب علم ہوا ہے۔ ایسا عقیدہ رکھنا اللہ تعالیٰ کے لیے جائز نہیں ہے۔ (النہایہ، ۱/۱۰۹)

روافض اللہ تعالیٰ کے لیے بدا مطلقاً جائز قرار دیتے ہیں بلکہ اس امر میں ان کی طرف سے مبالغات صادر ہوئے ہیں۔ یہاں تک کہ یہ ان کا عقیدہ فاسدہ بن گیا جو کافی میں موجود ہے۔ انھوں نے اصولِ کافی میں بابِ توحید میں بدا کے بارے مفصل لکھا ہے۔

اُصولِ کافی میں زرارہ بن اعینؒ سے روایت موجود ہے جس نے کسی امام سے سنا اور پھر بیان کیا:

مَا عَبَدَ اللّٰهُ بِشَيْءٍ مِثْلَ الْبَدَاءِ (الکافی، ۱/۱۴۶)

عقیدہ بدا پر روافض کا اجماع ہے۔ ان کے امام شیخ مفیدؒ نے یہی کچھ لکھا ہے۔ (محمد بن محمد بن نعمان، المعروف مفید، متوفی ۴۱۳ھ)

تمام اسلامی فرقوں نے اس عقیدہ بدا میں روافض کی مخالفت کی ہے۔ ان سب نے لکھا ہے: روافض کا اتفاق ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ایک صفت "بدا" بھی ہے۔

معتزلہ، خوارج، زیدیہ، مرجئہ اور اہلِ حدیث ان سب نے بھی امامیہ فرقہ کی مخالفت کی ہے۔ (اوائل المقالات، ص ۴۸-۴۹)

روافض کے لیے عقیدہ بداوہ عظیم مصیبت ہے جس سے وہ چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتے بلکہ تاویل سے کام لیتے ہیں۔ بدا کا معنی سے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف جہل کی نسبت دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو جہل لازم ہے۔ وہ امور تکوینی میں اس طرح نسخ کرتا ہے جس طرح امور تشریعی میں کرتا ہے۔ (حق الیقین فی معرفۃ اصول الدین عبداللہ شبر، ۱/۴۸)

ان کی کتب میں بھی ایسا لکھا ہے ان کے علماء بھی یہی بیان کرتے ہیں۔

تفسیر عیاشی میں ہے جو ان کی مشہور ترین تفسیر ہے۔ امام محمد باقر علیہ السلام نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا: وَ اِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰۤى اَرْبَعِیْنَ لَیْلَةً (البقرہ:۵۱) کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں اور تقدیر میں تیس راتیں تھیں۔ پھر اللہ تعالیٰ پر بدا ہوا تو دس راتیں بڑھا دیں تو اس طرح اس کے رب کی میقات اوّل و آخر چالیس راتوں پر تمام ہوئی۔ (العیاشی: محمد بن مسعود بن عیاشی)

اے قاری؟ ان کے اس قول پر غور کرو کہ اللہ کے علم اور تقدیر میں تھا تو اس سے وضاحت ہوتی ہے کہ اللہ کو حدوث علم ہوتا ہے یعنی اس کا علم حادث ہے۔

شیخ صدوقؒ نے بھی بدا کے عقیدہ کو اپنا عقیدہ کہا ہے۔ اس طرح شیخ طوسیؒ نے بھی لکھا ہے کہ سید مرتضیٰؒ نے فرمایا: بدا کا معنی ہے

امر کا ظاہر ہونا، جو پہلے ظاہر نہ تھا یا نہی سے بدا ہونا جو پہلے ظاہر نہ تھا۔ کیونکہ امر و نہی پہلے موجود نہ تھے کہ جس کا ادراک ہوتا۔ اب اُسے علم ہوا ہے، اب مستقبل میں امر کرے گا یا نہی کرے گا۔ اب یہی امر اور نہی اس وقت جانے جائیں گے :ب وہ وجود میں آئیں گے جس طرح اللہ تعالیٰ کا قول ہے:

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتّٰى نَعْلَمَ الْمُجٰهِدِيْنَ مِنْكُمْ (سورۃ محمد:۳۱)

''اور ہم تم لوگوں کو ضرور آزمائیں گے تا کہ تم میں جو لوگ جہاد کرنے والے ہیں اور (تکلیف) جھیلنے والے ہیں''۔

اس آیت کریمہ سے مراد یہ ہے ہم تمہارے جہاد کو جانتے ہیں اور اس وقت جانا جائے گا جب جہاد حاصل ہوگا، بدا کا معنی یہی ہے۔ (مجمع البحرین طریحی، ۱/۱۷۴)

اب روافض کا عقیدہ آپ کے سامنے ہے۔

خُذْ مَا تَرَاهُ وَدَعْ شَيْئًا سَمِعْتَ بِهٖ فِي طَلْعَةِ الْبَدْرِ مَا يُغْنِيْكَ عَنْ زُحَلِ

''جو چیز آنکھوں سے دیکھو اس کو قبول کرو۔ سنی سنائی باتوں کی طرف دھیان مت کرو چودھویں کا چاند تجھے زحل سے بے نیاز کر دے گا''۔

جواب ①...... جو کچھ بدا کے بارے میں آپ نے لکھا ہے اس کے مطابق جواب دوں گا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ہر صاحب فکر و عقیدہ اپنی فکر اور اپنے عقیدہ کو صحیح سمجھتا ہے۔ وہ اپنے مخالف کی بات کو قبول نہیں کرتا۔

②......دوسری بات یہ ہے کہ ابن اثیر نے اقرع اور ابرص کی حدیث کے

حسن میں لکھا ہے: اللہ تعالیٰ کو ان کے لیے بدا ہوا کہ وہ انھیں مبتلا کرے، یعنی اُس نے ان کے لیے یہی فیصلہ فرمایا۔ یہی وہ مسئلہ بدا ہے جو ہم کہتے ہیں وہی آپ کہتے ہیں۔(النہایہ فی اللغۃ، ج۱ص ۱۰۹۔ لسان العرب، ج۱ص ۳۴۸)

محترم آپ نے تمام باتیں تو کھول کر بیان کی ہیں، لیکن اُس نص کا آپ نے ذکر نہیں کیا وہی نص ہمارے مذہب شیعہ کی تائید کرتی ہے۔

۳...... تیسری بات یہ ہے ہم نے اپنے سابقہ رسالے میں ذکر کیا ہے کہ بدا کا مفہوم یہ ہے کہ کسی امر کا ظاہر ہونا، یعنی وجود و جسم کی صورت میں خارج میں ظاہر ہونا، حالانکہ وہ پہلے خارج میں موجود نہ تھا جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَبَدَا لَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا، یعنی ان کے گناہ متحقق ہوئے، مجسم صورت میں ہوئے اور ظاہر ہوئے جس طرح کہ کلمہ "علم" ہے۔ بہت سے مقامات پر آیاتِ قرآنی میں تحقق ظہور اور تجسم کے معنی میں آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَ مَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِیْ كُنْتَ عَلَيْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ (البقرہ:۱۴۳)

"آپ پہلے جس قبلے کی طرف رُخ کرتے تھے اُسے ہم نے صرف اس لیے مقرر کیا تھا تا کہ ہم رسول کی اتباع کرنے والوں کو اُلٹا پھر جانے والوں سے پہچان لیں"۔

اس طرح کی ایک اور آیت ہے:

ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ لِنَعْلَمَ اَیُّ الْحِزْبَيْنِ اَحْصٰى لِمَا لَبِثُوْٓا اَمَدًا (الکہف:۱۲)

"پھر ہم نے انھیں اُٹھایا تا کہ ہم دیکھ لیں کہ ان دو جماعتوں میں سے کون ان کی مدت قیام کا بہتر شمار کرتی ہے"۔

ایک اور آیت جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتّٰى نَعْلَمَ الْمُجٰهِدِيْنَ مِنْكُمْ وَالصّٰبِرِيْنَ

(محمد:۳۱)

''ہم تمہیں ضرور آزمائش میں ڈالیں گے یہاں تک کہ ہم تم میں سے جہاد کرنے والوں اور صبر کرنے والوں کی شناخت کرلیں''۔

یہ تمام امور اللہ تعالیٰ کے علم میں تھے لیکن خداوند تعالیٰ کا ارادہ یہ ہوا کہ یہ تمام امور محقق ہو جائیں، مجسم صورت اختیار کرلیں اور صفحۂ وجود پر ظاہر ہو جائیں اور خارج میں وقوع پذیر ہو جائیں۔

یہ سب کچھ جو آپ نے ملاحظہ فرمایا یہی بدا کا مفہوم ہے اور اس بیان کے بعد جو شخص مذہب شیعہ خیرالبریہ کی طرف یہ نسبت دے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف جہل کی نسبت دیتے ہیں وہ افترا پرداز ہے۔

اب اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف جہل کی نسبت دینا اور یہ کہنا کہ اُس پر فلاں امر مخفی تھا، جائز نہیں ہے۔ بلکہ یہ کہنا جائز ہے کہ ایک امر جو اُس کے علم میں تھا اب اس نے خارج میں وجود پکڑا ہے۔ اور جب اس امر کی بشر کی طرف نسبت دی جائے گی تو کہا جائے گا۔ یہ امر بشر پر مخفی تھا اب اس کے سامنے ظاہر ہوا ہے۔

اب ہم دوبارہ یہی کہیں گے کہ ہمارا جو عقیدہ بدا کے بارے میں ہے ہمارے غیر کو چاہیے کہ ہمارے عقیدہ سے بات کرے جو کچھ اپنے عقیدہ کے بارے ہم کہتے ہیں اُسی کو اپنائے ہم پر اتہام نہ لگائے۔

اگر وہ مناظرہ کرنا چاہتا ہے تو اسی بنیاد پر مناظرہ کرے جو ابھی ہم نے بیان کی ہے۔ اس کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اختراعات کرکے ان کی نسبت ہماری طرف دے دے اور پھر سب وشتم سے کام لے۔

④......کئی دفعہ ہم نے مختلف مقامات پر بیان کیا ہے کہ خداوند تعالیٰ نے اپنی مخلوق کی زندگی اور رزق حکمت کے مطابق مقرر کیا ہے اور اس امر کو لوح میں لکھ دیا ہے لیکن لوح میں وہ امور جو انسان کو عارض ہونے والے ہیں، ان کو نہیں لکھا۔

یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اُس ذات نے ایک شخص کو سو سال عمر دے دی ابھی وہ پچاس سال کا ہوا تھا کہ قتل ہوگیا۔ پھر اللہ تعالیٰ اس قاتل کو بہت جلد سزا دے گا کیونکہ اُس نے اُسے اس کی بقیہ زندگی سے محروم کر دیا۔ خداوند تعالیٰ نے کسی شخص کی عمر تو لوح میں لکھ دی لیکن یہ لوح میں تحریر نہ ہوا کہ یہ شخص قطع رحم کرے گا جس کی وجہ سے اُس کی زندگی میں نقص پیدا ہو جائے گا۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے لوگوں کو اس عمر کی خبر دی کہ عمر لوح محو و اثبات میں کم بھی ہوتی ہے اور بڑھ بھی جاتی ہے۔ آپؐ نے اُنھیں اس عارض کی خبر نہ دی کہ جو عمر کے بڑھنے اور کم ہونے کا سبب ہے کہ وہ قتل ہو جائے گا یا وہ قطع رحم کرے گا۔ خداوند تعالیٰ نے جو کچھ لوح میں تحریر کرایا وہ اس کی حکمت کے مطابق ہے، اور اُس میں اس بات کا بیان نہیں ہے کہ انسان ان عوارض کو اختیار کرے گا جو اس کی عمر کے نقص کے اسباب بن جائیں گے۔ اب ان تہمات کی اہمیت باقی نہ رہی جو تہمات اغیار نے ہم پر لگائے ہیں۔ انھی میں سے ایک ابن اثیر بھی ہے۔

⑤......آپ نے جو اعتراض کیا ہے کہ شیعیانِ اہلِ بیتؑ "کافی" کی مدح کرتے ہیں۔ جی ہاں! ہم مدح کرتے ہیں لیکن اتنی نہیں کرتے جتنی اہلِ سنت والجماعت بخاری کی مدح کرتے ہیں کیونکہ شیعیانِ حیدرِ کرّار کتاب کافی کی ہر حدیث کو صحیح نہیں کہتے لیکن اہلِ سنت والجماعت کا عقیدہ ہے کہ کتبِ ستہ میں جو کچھ ہے وہ سب صحیح ہے۔ جو الزام آپ ہمیں دے رہے ہیں حقیقت میں وہ آپ پر آتا ہے۔

⑥......آپ نے فرمایا کہ معتزلہ، خوارج، زیدیہ، مرجئہ اور اہلِ حدیث وغیرہ

مذہب امامیہ کے خلاف ہیں اور تمام لوگ شیعیانِ حیدرِ کرار کو اپنے طعن و تشنیع کا ہدف قرار دیتے ہیں۔ یہ تو کوئی بات ہی نہ ہوئی۔ آپ کو معلوم ہے ہر زمانے میں اہلِ حق قلیل رہے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے بھی اس امر کی طرف اشارہ فرمایا تھا کہ میری اُمت تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی اور ان میں سے صرف ایک فرقہ ناجیہ ہوگا اور باقی سب جہنم میں جائیں گے۔

اللہ تعالیٰ نے سورۂ واقعہ میں اہلِ ایمان کے بارے فرمایا ہے:

ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ○ وَقَلِيْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ ○

"ایک جماعت اگلوں میں سے اور تھوڑے لوگ پچھلوں میں سے ہوں گے"۔ (الواقعہ: ۱۳-۱۴)

اس تمام بحث کا مطلب و معنی یہ ہے: وہ لوگ جو کثرت میں ہیں اور شیعیانِ اہلِ بیت رسولؐ کے مخالف ہیں تو یہ کوئی دلیل نہ ہوئی کہ شیعوں کا عقیدہ فاسد ہے۔

اصل میزان وہ ہے جو دلیل بھی ہے اور برہان بھی ہے۔ جہاں وہ پایا جائے وہی حق ہے۔ اگر شیعوں کے پاس پایا جائے تو شیعہ حق پر ہیں۔ اگرچہ وہ تعداد میں کم ہی کیوں نہ ہوں۔

۷......وہ تشنیع جو ہماری کتب میں ہے اگر وہ صحیح ہے تو پھر وہ تشنیع جو بخاری میں ہے یا صحاح ستہ کی دوسری کتابوں میں ہے تو وہ بھی صحیح ہے۔ انھی کتب احادیث میں موجود ہے کہ قرآن میں تحریف ہوئی ہے اور آیات بھی خلاف ہوئی ہیں جیسا کہ سورۂ ضحیٰ ہے اور آیت زنا جو شیخ اور شیخہ کے بارے میں تھی۔ اس طرح کی کثیر روایات موجود ہیں۔ ہم نے اپنی کتاب "حقائق ھامہ حول القرآن" میں اس امر کی توضیحات پیش کی ہیں۔

صحیح بخاری میں موجود ہے: خداوند تعالیٰ جہنم سے پوچھے گا کیا تو اب سیر ہو رہی ہے تو وہ کہے گی: هَلْ مِنْ مَّزِيْد کچھ اور چاہیے۔ تو پھر خداوند تعالیٰ اُس میں اپنا پاؤں رکھے گا تو جہنم پکار اُٹھے گی: بس بس (اب میں سیر ہو گئی ہوں)۔ تو اب اس روایت کے بارے میں کیا کہیے گا کیا یہ صحیح ہے؟

۸ ...... آپ نے لکھا ہے کہ کتب شیعہ میں اور ان کے علما کے بقول خداوند تعالیٰ کی طرف جہل کی اور حدوثِ علم کی نسبت دی جاسکتی ہے، یہ سب غلط ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے:

① جہاں تک عیاشی کی روایت ہے کہ جنابِ موسیٰؑ کی میقات تیس راتوں پر مشتمل تھی۔ پھر وہ تیس راتوں والی میقات چالیس راتوں پر تمام ہوئی۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ اللہ کے علم میں اور تقدیر میں تیس راتیں تھیں۔ پھر اللہ تعالیٰ کو بدا ہوا تو دس راتیں بڑھا دیں تو ایسا کہنا دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم حادث ہے۔

اس کے جواب میں ہم یہ کہیں گے، اس حدیث سے مراد یہ ہے تقدیر حکمت کے مطابق ہے۔ میقات تیس راتوں پر مشتمل تھی۔ اللہ تعالیٰ نے لوح میں یہی کچھ لکھا تھا اور لوح محو و اثبات میں بھی یہی لکھا تھا۔

حدیث انھی لفظوں پر مشتمل ہے۔ لیکن وہ میقات محقق ہوئی۔ اس صورت میں جس طرح اُم الکتاب میں تھی اور وہ چالیس راتیں ہیں اور چالیس راتوں کا علم اللہ کے پاس موجود تھا۔ اب وہ میقات خارج میں مجسم صورت میں سامنے آئی۔

حدیث میں حدوثِ علم کے الفاظ نہیں ہیں بلکہ حصول بدا کے الفاظ ہیں کہ وہ علم خارج میں اس طرح ظاہر ہوا جس طرح اُم الکتاب میں تھا۔

② اس ضمن کا دوسرا سوال کہ وہ روایت جو جنابِ اسماعیلؑ کے بارے میں ہے تو اس کا وہی جواب ہے، جو ابھی ہم نے گذشتہ سطور میں بیان کیا ہے۔ جنابِ

اسماعیلؑ کی وفات اللہ کے علم میں تھی لیکن جب وہ فوت ہوئے تو وہی علم الٰہی مجسم ہو کر سامنے آ گیا۔

③ جہاں تک آپ نے شیخ طوسی کے بارے میں کہا ہے کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کی طرف جہل کی نسبت دی ہے۔ آپ نے کسی مقام پر ایسی بات نہیں کی۔ ہم نے کہیں اس امر کو ملاحظہ نہیں کیا۔ جی ہاں۔

④ جو روایت آپ نے شیخ طوسی کی بیان کی ہے کہ انھوں نے سید مرتضیٰ سے روایت کی ہے اور بطور استشہاد یہ آیت پیش کی ہے:

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتّٰى نَعْلَمَ الْمُجٰهِدِيْنَ مِنْكُمْ وَالصّٰبِرِيْنَ (محمد:۳۱)

"اور ہم تم لوگوں کو ضرور آزمائیں گے تاکہ تم میں جو لوگ جہاد کرنے والے ہیں اور (تکلیف) جھیلنے والے ہیں"۔

ہم نے اس سوال کا جواب دے دیا ہے۔ اب اگر کوئی اہلِ علم اللہ کی طرف جہل کی نسبت دے تو ہمارا موقف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف جہل کی نسبت دینا ہمارا عقیدہ نہیں ہے۔ شیعہ ایسے ہر قول اور ہر قائل سے برأت کا اظہار کرتے ہیں۔

تو اب ہم بھی یہی کہیں گے:

خُذْ مَا تَرَاهُ وَدَعْ شَيْئًا سَمِعْتَ بِهٖ فِيْ طَلْعَةِ الْبَدْرِ مَا يُغْنِيْكَ عَنْ زُحَلِ

"اس امر کو قبول کر، جس کو تو آنکھوں کے ساتھ دیکھ سکتا ہے اور سنی سنائی باتوں کو جانے دے۔ جب چودھویں کا چاند طلوع کرتا ہے تو پھر زحل سیارے کی ضرورت نہیں رہی"۔

حضرت امام حسین علیہ السلام کے مبارک سر کے بارے گفتگو

(لَوْلَاکَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاکَ)

سوال مجالسِ حسینیہ پڑھنے والے اسٹیج پر بیان کرتے ہیں کہ بعد از شہادت امام حسین علیہ السلام کے مبارک سر نے کلام (لَوْلَاکَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاکَ) کیا۔ کیا یہ روایت صحیح ہے؟ یہ بھی پڑھتے ہیں کہ ان کے جسمِ مبارک سے نور بلند ہوا جو آسمان سے جاٹکرایا۔ کیا یہ مبالغہ ہے؟ یا اس کی کوئی سند شرعی بھی ہے؟

جواب جی ہاں! یہ روایت موجود ہے، سر مبارک نے کلام کیا اور نور بھی ساطع ہوا۔ آج تک کسی نے بھی یہ ثابت نہیں کیا کہ یہ روایت جھوٹی ہے، یا مبالغہ ہے۔

جی ہاں اگر کوئی ہے، جو یہ دعویٰ کرتا ہے کہ یہ مبالغہ ہے تو پھر ہمارا چیلنج ہے کہ وہ اپنے دعویٰ کو ثابت کرے۔

قارئین کرام! اس سے عجیب تر بات تو یہ ہے کہ بعض لوگ مطالبہ کرتے ہیں کہ اپنے دعویٰ کو دلیل سے ثابت کرو۔ تو ایسے لوگوں سے میں کہوں گا جس طرح اثبات دلیل کا محتاج ہے تو اس طرح کسی امر کی نفی بھی دلیل کی محتاج ہوتی ہے۔ تو ہم اپنے دعویٰ کے منکرین سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ اس روایت کی نفی پر دلیل لائیں۔

اس کے علاوہ ہمارے اس دعویٰ کی دوسری دلیل یہی آپ کا سوال ہے۔ آپ نے کہا کہ مجالس پڑھنے والے اسی روایت کو نقل کرتے ہیں۔ جی ہاں! ہمارے علما ابرار کی تالیفات میں یہ سب کچھ موجود ہے۔

سوال میں کلمہ "سند شرعی" استعمال ہوا ہے تو اس کلمہ سے اس امر کی غرابت میں اور اضافہ ہوا ہے۔ اے کاش! معترض کو سند شرعی، صحیح اور سند صحیح غیر شرعی کے درمیان فرق کا علم ہوتا۔ پھر بات ان روایات پر ہو رہی ہو جن روایات کا تعلق و رابطہ

معصومؑ سے ہو۔

جی ہاں! وہ روایات موجود ہیں کہ حضرت امام حسین علیہ السلام کے مبارک سر نے آیاتِ قرآنیہ کی قرأت فرمائی اور اس کے علاوہ بھی گفتگو فرمائی۔ سُنّی اور شیعہ سب نے ان روایات کو بیان کیا ہے۔

انھی روایات کو آپ ارشاد مفید، خصائص الکبریٰ، ج ۲، ص ۱۲۵، ۱۲۷، مناقب آل ابی طالب، ج ۲، ص ۱۸۸، شرح الشافیہ، قصیدہ ابوفراس، ص ۱۴۸، مقتل العوالم، ص ۱۵۱، الخرائج والجرائح، تفسیر نور الثقلین، ج ۳، ص ۲۴۳، بحار، ج ۴۵، ص ۱۷۲۔ اس طرح کے اور مصادر ہیں جن کو شمار نہیں کیا جاسکتا۔ ان سب میں یہ روایت موجود ہے۔

اب رہا سوال کہ کیا مبارک سر کا گفتگو کرنا مبالغہ ہے؟ ہمارا جواب یہ ہے کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے یدِ مبارک پر کنکریوں کا تسبیح کرنا مبالغہ ہے؟ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معراج مبالغہ ہے؟ شق القمر مبالغہ ہے؟ حضرت علیؑ کے لیے سورج کا پلٹنا مبالغہ ہے؟ ملکہ بلقیس کا تخت پلک جھپکنے سے قبل لانا جنابِ ابراہیمؑ کا آگ میں نہ جلنا جناب امیرالمومنینؑ کا بابِ خیبر کا اکھیڑنا، جنابِ داؤدؑ کی معرفت جنابِ سلیمانؑ کا پرندوں سے باتیں کرنا، ان کے لیے جنوں کا، ہواؤں کا مسخر ہونا مبالغہ ہے؟ ان کے ساتھ چیونٹی کی گفتگو مبالغہ ہے؟ اگر ایسے لوگ یہی دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ سب مبالغہ ہے تو پھر ایسے لوگ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کو محدود کرتے ہیں۔

آخر میں ہم اصولِ کافی کی روایت پیش کرتے ہیں۔ جنابِ کلینیؒ سے روایت ہے انھوں نے سند کے ساتھ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کا فرمان بیان کیا ہے، آپؑ نے فرمایا: اللہ کی قسم! ہمارا وہ صحابی مجھے بہت زیادہ محبوب ہے، جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہو، سب سے زیادہ فقیہ ہو اور ہماری احادیث کو (وقت وحالات کی) مناسبت سے بیان کرنے والا ہو اور میرے نزدیک سب سے بدترین وہ ہے، جو ہماری طرف

منسوب حدیث کو سنے اور وہ حدیث ہم سے روایت کی گئی ہو اور پھر اُسے قبول نہ کرے۔ کیا وہ یہ نہیں جانتا (جو حدیث) اُس نے سنی ہے شاید وہ حدیث ہم سے صادر ہوئی ہو اور اُس کا اسناد ہم تک آیا ہو تو ایسا آدمی اس صورت میں ہماری ولایت سے خارج ہو جاتا ہے۔ (الکافی، ج۲، ص۲۲۳)

آلِ محمدؐ غرضِ خلقت انسانی کیوں قرار پائے؟

سوال حدیث قدسی ہے: لَوْلَاکَ (یامحمد) لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاکَ وَلَوْلَا عَلِیٌّ لَمَا خَلَقْتُکَ وَلَوْلَا فَاطِمَةُ لَمَا خَلَقْتُکُمَا جَمِیْعًا

"اے محمدؐ! اگر آپ نہ ہوتے تو میں کائنات کو پیدا نہ کرتا، اگر علیؑ نہ ہوتے تو آپ کو پیدا نہ کرتا، اگر فاطمہؑ نہ ہوتیں تو تم دونوں کو پیدا نہ کرتا"۔

اس حدیث کی توضیح فرمائیں۔ حدیث کے مضمون سے تو یہ معلوم ہوتا ہے حضرت علیؑ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے افضل ہیں اور حضرت فاطمہ زہراؑ دونوں سے افضل ہیں۔ اکثر لوگ اس حدیث کو تسلیم نہیں کرتے۔ اس حدیث کی صحیح تفسیر کیا ہے اور سند کے لحاظ سے اس کا کیا مقام ہے۔

جواب حدیث کا پہلا حصّہ: لَوْلَاکَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاکَ یہ حصّہ تو بالکل واقع اور حقیقت کے مطابق ہے۔ کسی شخص کا ایمان اس فرمان کی سند کا مطالبہ کر ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ خداوند تعالیٰ چاہتا ہے کہ ہر چیز پر کمال تک پہنچے۔

یہ پوری کائنات اور اس کے اندر جو کچھ ہے، چاہے وہ ذوی العقول ہیں یا غیر ذوی العقول، یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی صفت ہیں۔ پھر ہر ایک کو ان کے طبائع اور

استعداد کے مطابق تفویض فرمایا۔ یہ تمام مخلوق محدود ہیں اور جو محدود ہے تو وہ ناقص ہے اور زوال پذیر ہے۔ کیونکہ حقیقتِ حال کا تقاضا بھی یہی ہے اور وہ سب اپنے ذاتی عمق میں مرکوز ہیں۔

جب ہم نے تسلیم کرلیا کہ یہ وجود ناقص ہے، زائل ہونے والا ہے اور ہلاک ہونے والا ہے تو پھر یہ وجود اتنی بڑی وسیع و عریض کائنات کی کنہ معرفت تک نہیں پہنچ سکتا۔ پس وہ اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ اور اُس کی حکمت اور عظمت کے سامنے محدود ہے، لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ اُس کی مخلوق میں کوئی ایسا ہو، جو محل و مقام کے اعتبار سے جامع جمیع صفات ہو، کمال و جمال میں ایک بلند ترین اور وسیع ترین مقام رکھتا ہو اور یہی اس کائنات کی غرض و غایت ہے۔ جب دُور دُور تک نگاہ جاتی ہے تو سوائے رسول اللہؐ کے مقدس وجود اور امام علیؑ اور حضرت زہراؑ اور کوئی نظر نہیں آتا۔

جی ہاں! پھر ان کے نور سے آئمہ طاہرینؑ کو وجود ملا اور یہی آئمہ طاہرینؑ کے وجود کا سبب ہیں۔ انبیائے معصومین، اولیائے صالحین اور ملائکہ مقربین نے انھی سے استفادہ کیا اور انھی کی برکات سے بندگانِ خدا کو باقیات صالحات کا تمغہ عظیم ملا۔ ان لوگوں کو جو وجودِ فانی سے وجود باقی ملا وہ انھی سے ملا ہے اور پھر یہی بندگانِ خدا اللہ تعالیٰ کے مبداء فیض وعطا سے مربوط ہوئے۔ اسی ذات کو بقا ہے اس کے علاوہ سب کو فنا ہے۔

اس کے علاوہ جن و انس کی غرض و غایت کے بارے میں خداوند تعالیٰ نے فرمایا:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ○

''میں نے جنوں اور انسانوں کو نہیں پیدا کیا سوائے اپنی عبادت کے''۔(الذاریات:۵۶)

عبادت تامہ اُس وقت حاصل ہوتی ہے جس وقت معرفتِ تامہ حاصل ہو۔

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام نے لِیَعْبُدُوْنَ کی تفسیر لِیَعْرِفُوْنَ سے فرمائی کہ لِیَعْبُدُوْنَ کا معنی عبادت کے لیے نہیں ہے بلکہ معرفت و عرفان کے لیے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جن و انس کو اپنی معرفت کے لیے پیدا فرمایا، کیونکہ جن و انس عقل رکھنے والی مخلوق ہے۔ اسی ملکۂ عقل سے وہ کمالات کے حصول پر قادر ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے اس کائنات میں وہ تمام عوامل مہیا فرمائے، جن کے سبب یہ کمالِ عالیہ کو حاصل کر سکتے ہیں۔

اس تمام بحث سے یہ نتیجہ سامنے آتا ہے: حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، حضرت علی علیہ السلام اور حضرت فاطمہ زہراؑ تمام انسانوں سے معرفت و عرفان میں، بلند و بالا ہیں۔ ان کے اس عظیم مقام تک کائنات کو دُور دُور تک بھی رسائی کا حصول ناممکن ہے۔

جب اس کائنات کی وجہ تخلیق عبادت و معرفت ہے تو پھر لازم آتا ہے اسی مخلوق میں سے ایسے بندگان ہوں جو افضل عابدین ہوں۔

ہمارا مقصد مزید روشن ہو جاتا ہے جب ہم حدیث کساء کو دیکھتے ہیں:

مَا خلقت سماء مبینةً ولا ارضا مدحیةً ولا قمراً منیراً ولا شمسًا مضیئةً ولا فلکا یدور، ولا بحراً یجری وفلکاً تسری الا فی محبته هؤلا الخمسة الذین هم تحت الکساء

''بے شک میں نے یہ مضبوط آسمان پیدا نہیں کیا اور نہ پھیلی ہوئی زمین، نہ چمکتا ہوا چاند، نہ روشن تر سورج، نہ گھومتے ہوئے سیارے، نہ تھلکتا ہوا سمندر، نہ تیرتی ہوئی کشتی، مگر یہ سب چیزیں ان پانچ نفوس کی محبت میں پیدا کی ہیں، جو اس چادر کے نیچے ہیں''۔

اس عظیم الشان فرمان کی روشنی میں اس بیان سے حدیث قدسی کے اردگرد چھائے ہوئے سیاہ بادل چھٹ جاتے ہیں اور یہ ملکوتی حدیث لَوْلاکَ (یامحمد) لَمَا

خَلَقْتُ الْاَفْلَاکَ آفتاب کی طرح کائنات کو روشن کر دیتی ہے۔

ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ اس حدیث کے مضمون میں کوئی اشکال نہیں ہے اور نہ کوئی شک وشبہہ کی بات ہے۔ نہ تو ہمیں اس کی سند کی ضرورت ہے۔ اگر یہ روایت نہ بھی ہوتی تب بھی ایسا ہے جیسا اس حدیث کا مفہوم ہے۔ اس سے نہ انکار ہے اور نہ فرار ہے۔

حدیث کا دوسرا حصّہ: یہ امر واضحات میں سے ہے۔ اس عالمِ امکان کا قیام بہت سے عوامل پر منحصر ہے۔ اس کی ہر چیز اپنا ایک بنیادی موقع ومقام رکھتی ہے۔ کسی ایک چیز کا فقدان عالمِ امکان کے قیام کو ناقص کرسکتا ہے۔ کائنات کی ہر چیز غایت الٰہیہ کی حقیقت کی پاسبان ہے۔

آپ کوئی چیز لے لیں۔ اگر اس کے اجزا میں سے کوئی ایک جز علیحدہ ہوجائے تو اس چیز کا نظام معطل ہوجاتا ہے۔ آپ انسان کی مثال سامنے رکھیں۔ اگر اس کا سر قلم ہوجائے تو سارا جسم بے کار، اگر دایاں طرف شل ہوجائے تو سارا جسم بے فائدہ۔ اگر دایاں حصّہ مفلوج ہوجائے تو زندگی ختم۔ یہ انسان کے تمام عناصر واجزا ایک اساسی حیثیت رکھتے ہیں۔

ہم مزید وضاحت کے لیے عرض کریں گے: انسانی جسم میں قلب کا ایک بہت بڑا مقام ہے۔ وہ وہی ہے جس سے انسانی جسم کا قیام ہے۔ اگر اس کی حرکت بند ہوجائے تو حیات حیات نہ رہے، لیکن اس کی پاسبانی، حیاتِ انسانی عضو کی حیثیت اس وقت ختم ہوجاتی ہے جب جسم سے سر قلم کردیا جائے اور اسی طرح اگر سر موجود ہو یا قلب نہ ہو، بات وہی ہے زندگی کا خاتمہ۔

اب اسی اساس پر ہم پُر اعتماد ہوکر کہہ سکتے ہیں کہ امام علی علیہ السلام کا مبارک وجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بغیر وہ کام نہیں دے سکتا، جس کام کے لیے وہ خلق ہوئے ہیں۔

وہ غرض الٰہی کامل شکل اختیار نہیں کر سکتی۔ جس غرض کے لیے علیؑ پیدا ہوئے ہیں اور اس طرح نبی کریم ﷺ کا وجودِ مبارک امام علیؑ کے وجودِ مبارک کے بغیر اس غرض الٰہی کی کفایت نہیں کرتا، جس کے لیے ان کی تخلیق ہوئی ہے اور پھر اس طرح ان دونوں کے وجود کو حضرت فاطمہ زہراؑ کے وجودِ طیبہ کی ضرورت ہے۔ اگر وہ نہ ہوں تو اس کام کی تکمیل نہیں ہوتی، جس کام کے لیے ان سب کو اس دنیا میں بھیجا گیا ہے۔

اب تمام اشکالات، جو اس حدیث پر ہوتے رہتے ہیں، ان کی کوئی حیثیت نہیں رہتی۔ یہ حدیث قدسی ایک صحیح حدیث ہے:

لَوْلَا عَلِیٌّ لَمَا خَلَقْتُکَ ، وَلَوْلَا فَاطِمَۃُ لَمَا خَلَقْتُکُمَا

ہم کو یہ کہنے کا حق حاصل ہی نہیں ہے کہ فضیلت میں کون کم ہے۔ ہر ایک کے مراتب محفوظ ہیں بلکہ بات یہ ہے کمال وہاں ملتا ہے، جہاں یہ سب اکٹھے ہوں۔

شیطان کی شیطانیاں

سوال کیا رسول اللہ ﷺ پر شیطان کو دسترس حاصل ہے؟

جواب آپ کا یہ سوال کہ رسول اللہ ﷺ کے لیے ایک شیطان مقرر تھا، جو آپؐ کی روح، عقل اور سلوک پر اثر کرتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کی مدد فرمائی اور اُس کو آپ کے تابع کر دیا۔

یہ روایت مذہبِ اہلِ بیتؑ سے تعلق نہیں رکھتی۔ یہ روایت اہلِ سنت کی کتابوں میں ہے۔ شیعہ کتب میں کہیں موجود نہیں ہے سوائے ایک دو کتابوں کے۔ جیسا کہ عوالی اللئالی، ج ۴، ص ۹۷ اور علم الیقین، ج ۱، ص ۲۸۲ میں ہے لیکن انھوں نے اس روایت کو اہلِ سنت کی کتب سے لیا ہے۔

ہمارا عقیدہ وہی ہے، جو قرآنِ مجید نے بتایا ہے۔ قرآن مجید فرماتا ہے:

إِنَّهُ لَيْسَ لَهُ سُلْطٰنٌ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَلٰى رَبِّهِمْ

يَتَوَكَّلُوْنَ ○ (النحل:۹۹)

"شیطان کو یقیناً ان لوگوں پر کوئی بالادستی حاصل نہ ہوگی جو ایمان لائے ہیں اور اپنے رب پر توکل کرتے ہیں"۔

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ (الحجر:۴۲ والاسرا:۶۵)

"جو میرے بندے ہیں ان پر یقیناً تیری بالادستی نہ ہوگی"۔

ابلیس نے بھی اعتراف کیا تھا، جو کہ قرآن مجید نے بیان فرمایا ہے:

قَالَ فَبِعِزَّتِکَ لَاُغْوِیَنَّهُمْ اَجْمَعِیْنَ ○ اِلَّا عِبَادَکَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِیْنَ (ص:۸۲-۸۳)

"کہنے لگا مجھے تیری عزت کی قسم! میں ان سب کو بہکا دوں گا۔ ان میں سے سوائے تیرے خالص بندوں کے"۔

ان قرآنی توضیحات کے بعد اس حدیث کو قبول نہیں کیا جاسکتا کہ رسول اللہ ﷺ کے لیے ایک شیطان ہو اور وہ شیطان یہ کوشش کرے کہ اللہ کے رسول کو گمراہ کردے اور اس کی روح عقل اور سلوک کو متاثر کرے۔

ہمارے پاس اس حدیث کے خلاف دلیلِ قاطع موجود ہے۔ رسول اللہ ﷺ پر شیطان کیسے مسلط ہوسکتا ہے۔ پھر یہ کہ شیطان کو بھی اعتراف ہے۔ اب اس حدیث کی توجیہات یا تاویلات کی روشنی میں سلجھایا نہیں جاسکتا۔

اگر بفرضِ محال یہ حدیث صحیح بھی ہو اور اہلِ بیتؑ سے مروی بھی ہو اور جو دلائل اس کے رد میں آئے ہیں ان سے بھی چشم پوشی کرلی جائے تو ہم یہی کچھ کہیں گے کہ انبیائے علیہم السلام پر شیطان مسلط نہیں ہوسکتا۔

جی ہاں! ایک اور بات ممکن ہے کہ شیطان رسول اللہ ﷺ کے جسمِ مبارک

کو اذیت پہنچائے کیونکہ یہ اُس مردود کی کوشش رہی ہے لیکن شیطان عاجز ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے عقل و روح اور سلوک پر اثر انداز ہو۔ ہاں وہ آپ کے جسم کی تھکاوٹ کی کوشش کرسکتا ہے جیسا کہ قرآن مجید میں آیا ہے:

وَاذْكُرْ عَبْدَنَآ اَيُّوْبَ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗٓ اَنِّىْ مَسَّنِىَ الشَّيْطٰنُ بِنُصْبٍ وَّعَذَابٍ ○ (ص:۴۱)

"اور ہمارے بندے ایوبؑ کا ذکر کیجیے جب انھوں نے اپنے رب کو پکارا، شیطان نے مجھے تکلیف اور اذیت دی ہے"۔

آخر میں پھر وہی بات کہ اس حدیث کا ہمارے مذہب اہلِ بیتؑ کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کا تعلق اہلِ سنت کی روایات سے ہے۔

کفار سے ظہورِ کرامات / اجسام قبور میں فنا نہیں ہوتے

سوال عیسائیوں نے ٹیلی ویژن پر کچھ ایسے پروگرام دکھائے ہیں جو غیر عادی ہیں اور اُنھوں نے ان کو عجائبات کا نام دیا ہے اور یہ غیر عادی امور ان کے مذہبی لوگوں سے حاصل ہوئے ہیں۔ اُنھوں نے انھی سے یہ استدلال کیا ہے کہ ان کا عقیدہ سچا ہے، ان کا مذہب سچا ہے، اور یہ امور ایسے ہیں جن کے سامنے علم و طب عاجز ہیں۔

ا۔ ان اُمور کی تفسیر کیسے کی جاسکتی ہے۔ یہ امور کیا ہیں جن سے ان کے "قدسی" بیماروں کو شفا دے دیتے ہیں؟

ب۔ کیا یہ خارق عادت امور ان کے مذہب کی حقانیت کی دلیل ہیں یا وہ ان اُمور سے ہمیں گمراہ کرنا چاہتے ہیں؟

جواب آپ نے عیسائی مذہب کے مقدس لوگوں کی بات کی ہے جن کو ان

کی زبان میں "قدسی" کہا جاتا ہے جو اعجازی اور غیر عادی صورت میں مریضوں کو شفا دیتے ہیں۔

① ...... اس کے بارے میں قطعی صورت میں تو کچھ نہیں کہا جاسکتا کیونکہ یہ بات قطعی صورت میں ثابت ہی نہیں ہے۔ ہاں کچھ ایسے شبہات ہیں، جو ان کے ماحول، معاشرہ میں پیدا ہوتے ہیں، ان سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

② ...... اگر ہم عیسائیوں کے بارے میں یہ امر تسلیم کرلیں کہ یہ امر صحیح ہے۔ یہی بات ان کے علاوہ دوسرے گمراہ مذاہب کے لوگوں میں بھی پائی جاتی ہے۔

جی ہاں! کچھ عیسائی ایسے بھی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے آئمہ اطہار کے توسل سے بطور اعجاز شفا دی ہے۔ ممکن ہے ایسے لوگ آج بھی لبنانی معاشرے میں موجود ہوں۔

③ ...... تیسری بات یہ ہے دعا کا تعلق ایک حیران و پریشان انسانی قلب سے ہے۔ جب ایک آدمی اللہ تعالیٰ کی ذات پر یقین رکھتا ہے اور وہ مضطر و محزون ہوتا ہے۔ تو پھر اس کے دل سے جو دعا نکلتی ہے وہ اثر رکھتی ہے۔ یہی دعا اُس وقت کمزور ہوتی ہے جب معارف ایمانیہ سے دُور ہو لیکن پھر بھی یہ دعا قبول ہوتی ہے کیونکہ خداوند تعالیٰ محتاج یا مظلوم کو خائب و خاسر نہیں کرتا۔ جب وہ اس کی ذات سے محبت کرے اور اُس کی طرف کوشش کرے کیونکہ وہ رؤف بھی ہے اور رحیم بھی ہے تا کہ اُس کا بندہ اسی مقدار سے اُس سے مربوط رہے۔

اللہ تعالیٰ سے محبت کرنا ایک بہترین عمل ہے جسے وہ ذات ضائع نہیں جانے دیتی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے قرآن کے اندر فرمایا ہے:

أَنِّي لَآ أُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنكُم مِّن ذَكَرٍ أَوْ أُنثَىٰ

"میں تم میں سے کسی کے عمل کو ضائع نہیں جانے دیتا چاہے وہ

مرد ہو یا عورت"۔ (آل عمران:۱۹۵)

ایک دوسرے مقام پر فرمایا:

فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ (الزلزال:۷)

"جس کسی نے ذرہ بھر اچھائی کی اس کی جزا کو پائے گا"۔

دراصل دعا کی قبولیت کا تعلق صاحبِ حاجت سے ہوتا ہے۔ ان قدسیوں سے نہیں۔ یہ بات تو ہر ایک جانتا ہے کہ ہر وہ شخص جس کے اعمال حسنہ میں اللہ تعالیٰ اُس کے اعمال کو ضائع نہیں کرتا۔ جب ایک کافر اچھائی کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُس کی اس اچھائی کا اجر اس دنیا میں دے دیتا ہے تاکہ کل میدانِ محشر میں آئے تو خالی ہاتھ آئے۔

ایک روایت میں آیا ہے کہ ایک اہلِ کتاب کے ہاتھ پر غیر عادی امور انجام پائے تھے۔ ایک دفعہ جب حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے اُس سے اس راز کے بارے میں سوال کیا آخر یہ کیا ہے؟ تو اُس نے کہا: یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ میں اپنے نفس کی مخالفت کرتا ہوں تو اس دوران امامؑ نے فرمایا: تم اسلام قبول کرلو تو اس نے انکار کردیا۔ جب اُس نے امر امامؑ کی مخالفت کی تو اس کی وہ حالت جاتی رہی جو پہلے تھی۔

دعا کی قبولیت کے اسباب ہیں، جس کی طرف ہم نے ابتدا میں اشارہ کیا ہے۔

۴..... چوتھی بات ہے: آیات اور دعاؤں میں بعض حاجات کے لیے حقیقی اثرات ہیں۔ یہ اثرات اُس وقت پیدا ہوتے ہیں جب اس دعا یا آیت کا صحیح استعمال کیا جائے۔

عامل کوئی بھی ہو، مومن ہو یا کافر، کچھ اوراد و تعویذات ہیں۔ جب کوئی عاقل ان کا ورد کرتا ہے تو غیر عادی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ کچھ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں

جو محرمات کے لیے یہ کام کرتے ہیں حالانکہ ایسا نہیں کرنا چاہیے لیکن جہاں تک اوراد و اذکار کے اثرات کی بات ہے اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

۵...... پانچویں بات یہ ہے اس امر میں کوئی شک نہیں ہے۔ انھیں اوراد و اذکار سے بہت سے لوگوں کو امراض سے شفا ملی ہے۔ یا ان کے امراض میں تخفیف ہوئی ہے۔ وہی عامل کی بات اس میں کوئی فرق نہیں ہے کہ عامل مومن یا کافر تھا۔

۶...... چھٹی بات یہ ہے کہ ہم نے ہندو مرتاضین کو اچھی طرح دیکھا ہے کہ وہ روح کو اپنی مشکل ترین ریاضتوں سے مسخر کرتے ہیں۔ روح کو قادر مطلق نے بے پناہ استعدادیں عطا کر رکھی ہیں۔ مشکل ترین امور میں بھی اس سے کام لیے جاسکتے ہیں جو فطری نوامیس کے موافق ہوتے ہیں اور دائرہ کون و مکان میں محدود ہوتے ہیں۔ یہ سب کچھ ان لوگوں کو اپنی ریاضت کے بدولت حاصل ہوتا ہے۔ اکرام الٰہی سے ان کا دُور تک واسطہ بھی نہیں ہوتا۔ ایسے لوگوں کے لیے یہ خوارقِ عادت امور اس امر کی دلیل نہیں کہ وہ عنداللہ کوئی مقام رکھتے ہیں۔

انسانی جسم کا قبور میں سالم رہنا

سوال دوسرے سوال کا جواب کہ انسانی جسم قبور کے اندر سالم دیکھا گیا ہے، تو اس سوال کے جواب میں ہم یہ عرض کریں گے

جواب معصومین علیہم السلام کے فرمودات میں سے ہے: ایسا شخص جو غسلِ جمعہ بلا ناغہ کرتا رہے اس کا جسم کبھی فنا نہیں ہوگا، چاہے وہ جس زمین میں بھی دفن کیا جائے۔

علاوہ ازیں انسانی جسم کی طبیعت، ماحول اور فضا کے بھی خود انسانی جسم پر اثرات مرتب ہوتے رہتے ہیں۔ کچھ ایسے عوارض بھی جسمِ انسانی کو لاحق ہوتے ہیں جن کی وجہ سے اس میں مختلف تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔ ہر جسم کے خصوصی احوال بھی

ہوتے ہیں جن کو دیکھ کر دوسرے اجسام پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ یہ خاص احوال ظروف، ماحول اور حالات کے ہاتھوں گروی ہوتے ہیں۔

ایک وعدہ الٰہی ہے، جو اہلِ ایمان سے کیا گیا ہے جس میں اس عنوان سے تو کوئی بات نہیں کی گئی، ہاں اس کا وعدہ سچا ہے، جس کسی نے اس کے اوامر پر عمل کیا چاہے اُس کا تعلق جس زمانے سے ہو، یا جس جگہ سے ہو وہ ذات جس طرح چاہے گی اُسی طرح اُسے رکھے گی۔

دوسری بات یہ ہے کہ جہاں کہیں کھدائی کے دَوران کوئی قبور ملیں تو ان میں سوائے پرانی ہڈیوں کے اور کچھ برآمد نہیں ہوا۔ اور اکثر یہ مشاہدات میں آیا ہے۔ چند سال قبل مرنے والوں کی قبور کو جب دیکھا گیا تو وہاں ہڈیوں کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ تو پھر صدیوں پہلے مدفون افراد کی بات تو بہت دُور کی ہے۔

O......OOO......O

دوسرا حصہ

الامام والامامت

حضرت امام علی علیہ السلام اور حضرت زہراؑ کا حدیث غدیر سے احتجاج

میں آپ کا شکرگزار ہوں کہ آپ نے میرے پہلے سوال کا جواب مرحمت فرمایا ہے، اب میرے دو سوال ہیں ان کا تاریخ اور حدیث کی روشنی میں جواب مرحمت فرمائیں۔

سوال ① شیعیانِ اہلِ بیتؑ کے نزدیک حضرت امام علی علیہ السلام کی خلافت پر حدیثِ غدیر ایک بہت بڑی دلیل ہے۔ اس عنوان کے تحت کچھ ایسے مصادر بیان فرمائیں، جو اہلِ سنت کے طریقے سے ہوں کیونکہ اکثر اہلِ سنت اس حدیث کو تسلیم کرتے ہیں۔

سوال ② اگر امامت منصب الٰہی ہے اور اللہ اپنے خواص کو عطا کرتا ہے اور یہ عہدہ کوئی شخصی عہدہ نہیں ہے تو پھر شیعہ حضرات کے امام حسنؑ کے بارے میں کیا نظریات ہیں کہ امامؑ نے الٰہی عہدہ معاویہ کے حوالے کر دیا تھا۔ آپ اس سوال کے بارے میں کیا فرمائیں گے؟

جواب ① آپ کے پہلے سوال کے بارے میں یہ کہیں گے: پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ نے اقرار کیا ہے کہ اکثر اہلِ سنت نے اس حدیث غدیر کے صدور کا اقرار کیا ہے۔ جب حدیث ثابت ہے اور سبھی اُس کے صدور سے واقف ہیں۔ جب

پیغمبر اکرم ﷺ نے دسیوں ہزار لوگوں کے سامنے اپنا یہ فرمان جاری کر دیا تھا۔ اب انھیں حالات کی روشنی میں مزید کسی احتجاج کی ضرورت باقی نہیں رہتی تھی۔ اب میں مزید وضاحت کے لیے درج ذیل مثال دینا چاہوں گا۔ ایک آدمی جھوٹ کی حرمت کو سمجھتا ہو پھر اُس نے رسول اللہ ﷺ کی تاکیدات کو بھی سنا ہو، قرآنی آیات کو بھی پڑھا ہو اور سنا ہو۔

ایک دوسرا آدمی ہے جو چوری کے بارے جانتا ہے کہ کسی کا مال چرانا حرام ہے۔ اُس نے چوری کی حرمت پر مبنی آیاتِ قرآنیہ بھی پڑھی ہوں۔ ایک آدمی وجوبِ نماز سے واقف ہے اور قرآنی احکام کو پڑھتا بھی ہے اور سنتا بھی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے فرامین کو بھی پڑھتا اور سنتا ہے۔ اب جھوٹا آدمی جھوٹ بولے اور چوری کرنے والا چوری پر ڈٹا رہے۔ اور نماز نہ پڑھنے والا اپنی حالت پر باقی رہے۔ اب ایسی صفات کے حاملین سے احتجاج کیا جاسکتا ہے؟ ایسے لوگوں کے سامنے آیات اور روایات کا پیش کرنا عبث ہوگا۔

اور یہی حال ہے حدیث غدیر کا۔ جب ان لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کی مبارک زبان سے سنا پھر بھی انھوں نے اس فرمان پر عمل نہ کیا اور بنو اسلم کے ہزاروں مسلح افراد کے ساتھ حضرت زہراؑ کے گھر پر ہجوم کردیں۔ پھر انھیں ضربات لگائی جائیں، جس سے ان کا بیٹا سقط ہوجائے۔ پھر حضرت امیر المومنینؑ کو طاقت کے ذریعے بیعت پر مجبور کردیا جائے۔

آپ اس شخص کے بارے کیا کہیں گے، جس نے رسول اللہ ﷺ کو بسترِ مرض پر کہہ دیا ہو۔ اِنَّہُ لیھجر، کیونکہ پیغمبر اکرم ﷺ نے تو کاغذ قلم مانگا تھا کہ وہ تمہارے لیے تحریر کر دیں، جس کے بعد تم کبھی گمراہ نہ ہوں گے تو اُس نے رکاوٹ پیدا کر دی تھی۔ پھر یہی شخص خمِ غدیر میں بھی حاضر تھا اور اُس نے رسول اللہ ﷺ کے

اقوال سنے تھے۔ اور اُس نے حضرت علی علیہ السلام کی بیعت غدیر خم میں کی تھی۔ اس دن اور اُس دن کے درمیان صرف اڑھائی ماہ کا فاصلہ تھا۔ جہاں ایسے لوگ ہوں وہاں احتجاج بے فائدہ ہوتا ہے۔ اس لیے حضرت امام علی علیہ السلام اور حضرت زہراؑ نے احتجاج نہیں کیا تھا کیونکہ یہ تمام لوگ حدیثِ غدیر کو اپنی نمازوں اور روزوں کی طرح جانتے تھے۔

۲ آپ کا یہ کہنا کہ تاریخ میں یہ نقل ہی نہیں کیا گیا۔ اہلِ سنت کی تاریخ میں نقل نہ ہونا یہ کوئی دلیل نہیں ہے کہ سرے سے یہ بات ہی نہیں۔ یہ تو زمانے کے اصول رہے ہیں کہ جس کو مٹاتا ہے تو اُس کو اچھی طرح سے مٹاتا ہے۔ کہیں اس کے آثار کو رہنے نہیں دیتا اور یہ سب کچھ حضرت امام علی علیہ السلام کے ساتھ کیا گیا۔ جب اس زمانے کے لوگوں کو آپ کا یہ منصب پسند نہ آیا تو وہ لوگ آپؑ کے اس منصب جلیلہ کے آثار کو کیسے بیان کرتے اس لیے آپؑ کے مخالفین نے وہی کیا جو ان کو کرنا چاہیے تھا۔

۳ محدثین اور مؤرخین نے جو کچھ بیان کیا ہے۔ یہ کوئی دلیل نہیں ہے ان کی روایات اور اقوال حدیث غدیر کے بالمقابل باطل ہیں اور جو شخص اپنے صحیح ہونے کا دعویٰ کرتا ہے تو وہ اپنے دعویٰ پر دلیل لائے۔ جو دلائل حضرت امام علی علیہ السلام کی امامت کے ہیں وہ اقویٰ ہیں۔ مسئلہ امامت علیؑ سے انکار کر دینا کہ ان کے پاس ادلہ شرعیہ میں اس دعویٰ کی اُس وقت کوئی حیثیت نہیں رہتی کیونکہ دین اسلام کے جتنے قضایا ہیں وہ قرآن مجید سے ثابت کیے جاتے ہیں اور عترتِ رسولؐ اللہ کی روشنی میں حل ہوتے ہیں۔ اور جو لوگ ان کی مخالفت میں ہیں تو پھر وہ انھیں کیسے تسلیم کریں گے۔

۴ اہلِ سنت کے کئی ایک مصادر ہیں جن میں یہ روایات موجود ہیں کہ حضرت امام علی علیہ السلام نے حدیث غدیر کے ذریعے احتجاج فرمایا۔ آپ نے یہ بھی کوشش فرمائی تھی کہ جو لوگ خمِ غدیر میں موجود ہیں کہ جو کچھ انھوں نے دیکھا اور سنا ہے اُسے باقی لوگوں تک پہنچائیں اور وہ شواہد یہ ہیں:

احتجاجات حضرت امام علی علیہ السلام

① یوم شوریٰ: شوریٰ کے دن اصحاب جمع تھے کہ آپؑ نے صحابہ کبار کی مجلس میں حدیث غدیر سے احتجاج فرمایا۔ آپؑ نے فرمایا: میں تم لوگوں پر وہ حجت پیش کروں گا جس کے مقابل نہ کوئی عرب ٹھہر سکتا ہے اور نہ عجم۔ پھر آپؑ نے فرمایا: اللہ کی قسم! اے لوگو! کیا تم میں سے کوئی ایسا ہے جس نے مجھ سے پہلے توحید کا اقرار کیا ہو؟ تو ان سب نے جواب دیا: نہیں۔

پھر آپؑ نے ان لوگوں پر دوسرا سوال کیا۔ میں تمہیں اللہ کی قسم دے کر کہتا ہوں کیا تم میں کوئی ایسا ہے جس کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہو:

مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَهٰذَا عَلِیٌّ مَوْلَاهُ اَللّٰهُمَّ وَالِ مَنْ وَالَاهُ، وَعَادِ مَنْ عَادَاهُ، وَانْصُرْ مَنْ نَصَرَهُ لِيُبَلِّغَ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ، غَيْرِیْ

"جس کا میں مولا ہوں اُس کا علیؑ مولا ہے، اے اللہ! تو اُس سے محبت رکھ جو اس سے محبت رکھے اور اُس سے دشمنی رکھ جو اس سے دشمنی رکھے، تو اُس کی مدد کر جو اس کی مدد کرے، جو حاضر ہے وہ غائب تک یہ پیغام پہنچائے"۔

آپؑ نے فرمایا: کیا کوئی ایسا ہے؟

سب نے کہا: نہیں۔ (الغدیر، ج۱، ص۱۵۹، شرح نہج البلاغہ معتزلی، ج۲، ص۶۱)

صاحب دارقطنی، ابن مردویہ اور ابی یعلی وغیرہ نے ان روایات کو نقل کیا ہے۔ اگر ہم فرض بھی کرلیں کہ اس حدیث کے بعض رجال اسناد ضعیف ہیں لیکن یہ روایت اپنی حقانیت پر ہیں۔ روز روشن کی طرح صاف شفاف ہے کیونکہ اساسی طور پر یہ روایت معلوم ہے۔ جی ہاں کچھ ایسے راویانِ احادیث ہیں جنھوں نے مصالح سے

کام لیا ہے اور اس حدیث کے مضمون کی مخالفت کی ہے۔

② دورِ ثالث میں احتجاج: حضرت عثمان کا دور تھا اس زمانے میں آپ نے مسجد میں صحابہ کے مجمع میں جن کی تعداد دو سو سے بڑھ کر تھی، اسی حدیث کے ذریعے احتجاج فرمایا۔ یہ روایت فرائد السمطین، ص ۱۲۳ میں موجود ہے۔ الغدیر، ج ۱، ص ۱۶۳، ۱۶۵ میں بھی دیکھ سکتے ہیں۔

③ آپؑ نے رحبہ کے دن ۳۵ھ میں لوگوں میں اس حدیث کے ذریعے احتجاج فرمایا۔ اکثر اہلِ سنت کے علما نے نقل کیا ہے۔ (الغدیر، ج ۱، ص ۱۶۶، ۱۸۴)

④ آپؑ نے جنگِ جمل کے میدان میں اس حدیث غدیر کے ذریعے احتجاج فرمایا۔ حاکم نے مستدرک، ج ۳، ص ۳۷۱ میں نقل کیا ہے۔ (مروج الذہب، ج ۲، ص ۸ و مناقب خوارزمی، ص ۱۱۲)

⑤ حدیث الرکبان، الغدیر، ج ۱، ص ۱۸۷، ۱۹۱ میں یہی روایت درج ہے۔

حضرت سیدہ زہرا سلام اللہ علیہا کا احتجاج

شمس الدین ابوالخیر الجزری الدمشقی الشافعی نے اپنی کتاب اسنی المطالب فی مناقب سیدنا علی بن ابی طالب، ص ۴۹، ۵۱ میں یہ روایت نقل کی ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ حدیث لطیف ترین اور غریب ترین طریقے سے حاصل ہوئی۔

وہ لکھتے ہیں کہ ہمارے بزرگوار ابوبکر محمد بن عبداللہ الحب مقدسی نے ہمیں بیان کیا۔ انھوں نے کہا کہ انھیں اُمِ محمد زینب دختر احمد عبدالرحیم المقدسیہ نے بیان کیا۔ انھوں نے ابوالمظفر محمد بن فتیان بن المثنی سے سنا، انھوں نے ابوموسیٰ محمد بن ابوبکر الحافظ سے سنا، انھوں نے اپنے والد کی پھوپھی کے بیٹے قاضی ابوالقاسم عبدالواحد بن محمد بن عبدالواحد المدنی سے، ان کی مجلس میں سنا، انھوں نے ظفر بن داعی علوی اشترآبادی سے سنا، اُس نے اپنے والد ابواحمد بن مطرف سے، انھوں نے کہا کہ ہمیں

ابوسعید ادریسی نے بیان کیا، انھوں نے یہ حدیث محمد بن محمد بن الحسن ابوالعباس رشیدی سمرقندی سے لی۔ یہی رشید ہارون رشید کے خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ ہم نے جو کچھ لکھا ہے انھیں سے لکھا ہے۔ ہمیں ابوالحسین محمد بن جعفر حلوانی نے بتایا، اُس نے کہا: ہمیں علی بن محمد بن جعفر اھوازی نے (وابستہ رشید) بتایا، اُسے بکر بن احمد قسری نے بتایا، اُس نے کہا ہمیں فاطمہ، زینب اور اُم کلثوم دختران موسٰی بن جعفرؑ نے بتایا۔ ان سب نے کہا: انھیں فاطمہ بنت جعفر بن محمد صادقؑ نے بتایا۔ اُس نے کہا: مجھے فاطمہ بنت محمد بن علیؑ نے بتایا، اُس نے کہا: انھیں مجھے فاطمہ بنت علی بن الحسینؑ نے بتایا۔ اُس نے کہا: مجھے فاطمہ وسکینہ بنت علی بن الحسینؑ نے بتایا۔ اُس نے کہا: مجھے فاطمہ وسکینہ دختران امام حسین بن علیؑ نے بتایا۔ انھوں نے جناب اُم کلثوم بنت فاطمہؑ سے سنا، انھوں نے فاطمہ بنت پیغمبرؐ سے سنا، انھوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ آپؐ نے فرمایا کیا تم لوگ خم غدیر کا وہ فرمانِ رسولؐ بھول گئے ہو: مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَهٰذَا عَلِيٌّ مَوْلَاهُ؟ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا: انت منی بمنزلة هارون من موسٰی؟

حافظ ابوموسٰی نے اپنی کتاب میں یہ تخریج نقل کی ہے۔ ان کی کتاب کا نام المسلسل بالاسماء ہے۔ ایک طرح سے مسلسل ہے۔ ان میں جتنی خواتین ہیں ان سب کے اسماء فاطمہ ہیں۔ پھر انھوں نے اپنی کسی پھوپھی سے روایت سنی۔ (الغدیر، ج ۱، ص ۱۹۷)

دوسرا سوال: اس سوال کا جواب میری کتاب مختصر مفید، ص ۵۴، ۵۹ میں موجود ہے، اُدھر رجوع فرمائیں۔

کتاب اللہ کا علم کس کے پاس ہے؟

سوال قرآن کریم کی آیت ہے: قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًاۢ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ (سورۂ رعد: ۴۳)

"کہہ دیجیے میرے اور تمہارے درمیان گواہی کے لیے اللہ اور وہ جس کے پاس کتاب کا علم ہے، کافی ہیں"۔ اس آیت کریمہ کے مطابق شاہد حضرت امام علیؑ ہیں جن کے پاس کتاب کا علم ہے یا کوئی اور ہے؟ حضرت امام علی علیہ السلام تو وہ ہیں، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لائے تھے۔ یہ جھگڑا جو ہے، وہ رسولؐ اللہ اور مشرکین کے درمیان تھا۔ یہ بات سمجھ نہیں آتی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کس طرح مشرکین کو کہیں گے اور ان سے اپنی بات منوائیں گے کہ ان کی نبوت کی تصدیق ان کے ساتھی حضرت امام علی علیہ السلام کریں گے۔ جب وہ رسالت کو برداشت نہیں کر سکتے تو پھر اُس پر ایمان لانے والے کی بات کو کس طرح قبول کریں گے۔ جب صورتِ حال یہ ہو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایسا کیسے کر سکتے ہیں کہ اپنا شاہد حضرت امام علی علیہ السلام کو قرار دیں جب کہ آپ کو معلوم ہے کہ مشرکین ان کی شہادت کو قبول کرنے والے نہیں ہیں؟ اس اشکال کی موجودگی میں اس آیت کریمہ کی تفسیر کی روایات جن کے مطابق شاہد امام علیؑ ہیں ساقط ہو جاتی ہیں۔ توضیح فرمائیں؟

جواب پہلی بات تو یہ ہے کہ تمام روایات متواترہ جن کے اسناد صحیح ہیں آیت کریمہ کے مصداق حضرت امام علی علیہ السلام ہیں اور آئمہ طاہرینؑ میں جو آپؐ کی ذریت سے ہیں۔ یہ تمام روایات ہر قسم کے اشکال کا رد ہیں کیونکہ آئمہ اہلِ بیتؑ قرآنِ ناطق ہیں اور ثقلین میں سے ہیں۔ خداوند تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا کہ ہم ان سے تمسک کریں۔ ممکن ہی نہیں ہے کہ اتنی کثیر روایات جو سب کی سب صحیح ہیں ان کی تکذیب ہو اور یہ روایاتِ متواترہ شیعہ طریقے سے بھی ہیں اور اہلِ سنت کے طریقے سے بھی

بیان ہوئی ہیں۔ اب ہم اس ضمن میں صرف تین روایات نقل کرتے ہیں اور وہ یہ ہیں:

① حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: وہ جس کے پاس کتاب کا علم ہے وہ حضرت امام علی علیہ السلام ہیں۔ جب آپؑ سے پوچھا گیا کیا وہ اعلم ہے، جس کے پاس کتاب کا کچھ علم ہے یا وہ جس کے پاس کتاب کا کُل علم ہے؟ آپؑ نے فرمایا: جس کے پاس کتاب کا کچھ علم ہے اس کے علم کی مقدار اس ہستی کے علم کے مقابلے میں اتنی ہے جتنا ایک مچھر سمندر سے پانی لے سکتا ہے؟ (تفسیر قمی، ج ۱، ص ۳۶۸)

② حضرت امام محمد باقر علیہ السلام نے اس آیت کی تفسیر کے بارے میں فرمایا: امام علی علیہ السلام ہمارے پہلے ہیں، ہم سے اولویت رکھتے ہیں، ہم سب سے افضل ہیں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد پوری کائنات سے بہتر و برتر ہیں۔ (بصائر الدرجات، ص ۲۳۶)

③ ابی بکیر نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے سنا، یہی راوی جب آپ کی مجلس میں تھا تو لوگوں نے جنابِ سلیمان نبی اور ان کے علم اور ملک کا ذکر کیا تو آپؑ نے مجھے فرمایا: سلیمان بن داؤدؑ کو کیا عطا کیا گیا؟

ہاں اس کے پاس اسمِ اعظم کا صرف ایک حرف تھا اور اللہ تعالیٰ نے تمہارے امیر کی شان میں فرمایا:

قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۢ بَيْنِيْ وَ بَيْنَكُمْ ۙ وَ مَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ

اللہ کی قسم! حضرت امام علی علیہ السلام کے پاس کتاب کا کُل علم تھا۔

پس میں نے کہا: مولاؑ! آپؑ نے سچ فرمایا، میں آپؑ پر قربان جاؤں۔ (بصائر الدرجات، ص ۲۳۲)

جب آئمہ اہلِ بیتؑ کے بارے میں خبر یقین کی منزل پر موجود ہے اور روایاتِ متواترہ سے ثابت ہے۔ یہ تمام روایات سند کے لحاظ سے صحیح ہیں تو ان

صورتوں میں کسی اشکال کی گنجائش نہیں رہتی ہے اور نہ کسی شک وشبہے کی گنجائش رہتی ہے کیونکہ یہ تمام روایات حدسیات کی منزل پر ہیں۔ خداوند تعالیٰ اس شخص کے حال پر رحم فرمائے جو حدود کو پہچان کر وہیں ٹھہر جائے۔

ایک اور بات کہ یہ آیت کریمہ اپنے مصداق کے لحاظ سے اتنی واضح ہے کہ مزید کسی وضاحت کی ضرورت نہیں۔ حضرت امام علی علیہ السلام کے علاوہ کوئی اور ہے ہی نہیں جس پر یہ آیت صادق آئے۔ نہ تو عبداللہ بن سلام ہے اور نہ کوئی اور۔

جی ہاں! اغیار کی ایک ناکام کوشش ہے وہ آیت کے مصداق میں تصرف کی کوشش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس آیت کا مصداق یہودی عبداللہ بن سلام ہے۔ ہم نے ان کی اس کوشش کی جڑوں کو ہی کاٹ ڈالا ہے۔

اب اس آیت کریمہ کے نقاط کے بارے کچھ مزید وضاحت کریں گے:

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَسْتَ مُرْسَلًا قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًاۢ بَيْنِيْ وَ بَيْنَكُمْ وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ ○

(الرعد:۴۳)

"جن لوگوں نے کفر اختیار کیا تو وہ کہتے ہیں (اے رسولؐ) تو رسول نہیں ہے۔ آپ کہہ دیجیے میرے اور تمہارے درمیان گواہی کے لیے اللہ اور جس کے پاس کتاب کا علم ہے، کافی ہے"۔

پہلی بات تو یہ ہے حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور کفار کے درمیان اگر کسی اہلِ کتاب کو شاہد مانتے ہیں تو پھر یہ صورت سامنے آتی ہے۔ اہلِ کتاب وہ ہیں، جنھوں نے نبی کی نبوت کا انکار کیا اور نبیؐ پر ایمان نہیں لائے تو ان کی گواہی سے اعتراف حق کا نتیجہ کیسے نکالا جا سکتا ہے۔ ان کی گواہی کی کوئی حیثیت ہے ہی نہیں۔ وہ تو آپؐ کی دعوت حق کو کمزور کرنے کی کوشش میں تھے۔

پھر ہم ان لوگوں سے اس بات کی کیسے توقع کر سکتے ہیں کہ کیا وہ لوگ اتنا جلد اپنے دین کو باطل قرار دیں گے اور اس نئے دین کی حقانیت کو قبول کرلیں گے جو ان کے بالمقابل آ گیا ہے اور اُن کے دین کی نفی کر رہا ہے۔

جی ہاں! اگر اس آیت کا مصداق عبداللہ بن سلام کو اس کے اسلام لانے کے بعد قرار دیں تو یہ مسئلہ عقل و دانش کے اعتبار سے قابلِ قبول ہی نہیں ہے کیونکہ ابھی وہ دائرۂ اسلام میں داخل ہوا ہے۔ اس پر کیسے اطمینان کیا جاسکتا ہے کہ وہ سچ بھی بولنے لگے گا اور شہادت کو بھی نہیں چھپائے گا۔ اور وہ خواہشاتِ نفس کو ذبح کردے گا۔ یہ کیسے ممکن ہے وہ معصوم تو ہے ہی نہیں۔

پھر بہت جلد اس کی اسلامی زندگی نے ثابت کر دیا کہ وہ کب حق کا وفادار رہا ہے۔ اس نے ہمیشہ اپنے نفس کی خواہشات پر عمل کیا اور امام حق کی مخالفت کی اور ان کے راستے پر چلا۔ جو کچھ بھی نہیں جانتے تھے۔

اس طرح باقی موارد میں اہلِ کتاب نے ہمیشہ حق کو چھپایا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے اپنے قرآن میں ان کی ان صورتوں کو بیان کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی تنبیہ کی اور ان کے بارے میں فرمایا۔ وہ اپنی کتاب میں تحریف سے کام لیتے ہیں۔

آیئے قرآن مجید کی اس آیت کی تفسیر کو دیکھیں:

قُلْ فَأْتُوْا بِالتَّوْرٰىةِ فَاتْلُوْهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ (آل عمران: ۹۳)

"کہہ دیجیے اگر تم سچے ہو تو تورات لے آؤ اور اُسے پڑھو"۔

اور سورۂ نساء (آیہ ۴۶) میں فرمایا:

مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ

"یہودیوں میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو کلمات کو ان کی جگہ

سے بدل دیتے ہیں"۔

جو لوگ ایسی عادات و اطوار کے مالک ہوں کیا ان سے شہادت لی جاسکتی ہے؟ کیا ان کی شہادت ایک عادل کی شہادت ہوسکتی ہے؟ حیرانی کی بات ہے قرآن مجید کی ایسی تفاسیر جو حق سے دُور لے جانے والی ہوتی ہیں، کس مقصد کی خاطر کی جاتی ہیں۔ اس لیے کہ بعد میں آنے والی نسلیں اپنے اسلاف سے مستفید نہ ہوں؟ کیا یہ دھوکہ نہیں ہے؟ جی ہاں! یہ سب سے بڑا فریب ہے۔

اس بات سے کسی کو انکار نہیں کہ اہلِ کتاب ہمیشہ اپنے مذہب کی بقا کی جنگ لڑتے آئے ہیں اور انھوں نے حق کو چھپانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔

اب تھوڑا سا سیاقِ آیت کی طرف سفر کرتے ہیں اور کلمۂ کفی کی تعبیر میں داخل ہوتے ہیں۔ آیت کریمہ کے اندر "کلمہ شہید" استعمال ہوا ہے کہ اس شہید کی شہیدیت کی بات ہے جو کتاب کا عالم ہے۔ پھر اس کی اسی شہیدیت کو اللہ تعالیٰ کی شہیدیت سے ملا دیا گیا ہے تو اس تعبیر قرآنی سے اہلِ ایمان کو کیا فائدہ ہوا؟

جی ہاں! اس ملکوتی تعبیر سے حق وحقانیت کی ضمانت مل گئی ہے اور اس شاہد کی صداقت اور امانت پر طمانیت شدیدہ کی ملکوتی کیفیت حاصل ہوگئی ہے کہ یہ وہ شہید ہے جو شہادت کو کبھی نہیں چھپائے گا اور اُس کی یہ شہادت جو حق کی صداقت کے لیے ہے۔ اس کی اساس اعجاز اور اخبار غیب ہے۔ یہ تمام صفات یہ بتاتی ہیں کہ یہ شاہد ایک انسان ہے اور حق و باطل کے مواطن پر نگاہ کامل رکھتا ہے۔ معصوم ہے اور خواہشات نفس کی نفی کرتا ہے اور باطل کے قلع قمع کے لیے آمادہ ہے۔

② حدیث کا رُخ مشرکین اور کفار کی طرف ہے، جو نہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اعتراف کرتے ہیں اور نہ اہلِ کتاب کا اعتراف کرتے ہیں۔ ہاں البتہ وہ احکام میں ان کے تابع تھے اور ان کے دین میں داخل تھے۔ پھر اس شہادت کی نسبت ان کی

طرف دینے کا کیا مطلب ہے؟ حالانکہ سبھی جانتے ہیں کہ وہ خطا کار بھی ہیں اور گمراہ بھی ہیں؟ اور پھر مقام تحدی میں یہود کی شہادت کو اللہ تعالیٰ کی شہادت سے مقرون کرنے کا کیا معنی ومقصد ہے؟

③ آیت کریمہ میں لفظ ''شہید'' استعمال ہوا ہے نہ کہ لفظ ''شاہد''۔ تعبیر طبیعی میں لفظ ''شہادت'' ان موارد میں استعمال ہوتا ہے، جہاں اختلاف ہو اور یہی شہادت شاہد کے ذریعے ادا ہوتی ہے تو ان موارد میں لفظ شاہد استعمال ہوتا ہے نہ کہ لفظ ''شہید'' اور یہ مبالغہ کا صیغہ ہے۔

④ تھوڑی سی مزید وضاحت کے لیے یہ کہوں گا عادتاً یہ نہیں کہا جاتا کہ فلاں میرے اور تمہارے درمیان شاہد ہے بلکہ کہا جاتا ہے فلاں فلاں پر شاہد ہے یا فلاں فلاں امر پر شاہد ہے۔

میرے محترم برادر نے جو ذکر کیا ہے ممکن ہے کہ کلمہ بيني وبينكم کی تعبیر اس امر کی طرف اشارہ ہو کہ شاہد طرفین کے درمیان ہوتا ہے۔ دونوں طرفین برابر ہوتی ہیں اور شاہد درمیان میں ہوتا ہے اور وہ کسی کی طرف عدالت کے اعتبار سے میلان نہیں رکھتا اور یہی بات شہادت میں وثاقت، امانت اور عدالت عطا کرتی ہے۔ آخرکار یہی شہادت امر میں فیصل کا کردار ادا کرتی ہے۔ شاہد حاکم ہوتا ہے اور نزاع کا قاطع ہوتا ہے۔ اس طرح کلمہ ''شہید'' کے ذریعے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ صاحب جسے شہید کا نام دیا گیا ہے، اپنے حضور اور اطلاع میں شدت رکھتا ہے۔ اس کے ذریعے یہ امر حتمی طور پر قبول کیا جائے گا۔

ہمیں اپنے برادر عزیز سے اتفاق ہے کہ شہیدیت سے مراد ایسا حضور ہے جو مضبوط ترین اور قوی ہو لیکن ہمیں اس امر سے اتفاق نہیں ہے کہ اس شہادت سے مراد وہ شہادت نہیں ہے جو دو جھگڑا کرنے والوں کے درمیان ہوتی ہے، بلکہ یہ شہادت

شہیدیت ہے۔ حضور قوی ہے اور محکم ہے کیونکہ جب انسان صدق کی معرفت رکھتا ہے خصوصاً ایسے امر میں جس میں کسی کی آمد کو دکھایا نہیں جاسکتا۔ جس طرح جناب جبرئیلؑ کا حضورؐ کے پاس آنا کیونکہ عادی طور پر عام بشر کے لیے یہ حالت میسر نہیں ہے۔ پھر اس امر کا مفہوم ومطلب یہ ہوا کہ یہ شہید وسائل عالیہ کی ملکیت رکھتا ہے اور وہ امور جو مخفی ہیں اور جن کو عادتاً عام بشر نہیں پاسکتا لیکن یہ شہید ان میں حضور کی قدرت رکھتا ہے اور پھر اسی شہید کی شہیدیت کو ہم جس زمانے میں رہ رہے ہیں نہیں سمجھ سکتے شاید کہ وہ اس سے بہت زیادہ بلندوبالا اور ارفع و اعلیٰ ہو اور وہ امام اور امامت کی شہیدیت ہے جس کے آثار میدانِ قیامت میں ہویدا ہوں گے۔

ہم اپنی تمام گفتگو کو لے کر آخر اس منزل پر پہنچے ہیں، جو ہمارا مقصود ہے اور یہ تمام بحث اسی معنی کی تائید وتاکید کرتی ہے۔ شہیدیت کا معنی حضور ہے ادائے شہادت نہیں ہے۔

آیت کریمہ میں کوئی ایسا اشارہ موجود نہیں ہے کہ جس سے مراد تورات یا انجیل ہو۔ اگر کوئی ایسی تطبیق کی تحریک رکھتا ہے تو پھر وہ یا تو اخرس ہے یا رجیم۔ جس کے دروازے حق کو سننے کے لیے بند ہیں۔ ہم نے ان روایات کو دیکھا ہے، جو معصومین علیہم السلام سے مربوط ہیں۔ جن میں اس کتاب کی طرف اشارات موجود ہیں۔ اس کتاب سے مراد وہ کتاب ہے، جس کے ذریعے عالمِ تکوین میں اُس کا عالم تاثیر کی قدرت رکھتا ہے اور موجودات کی نگرانی کرتا ہے۔ روایات میں یہ سب کچھ موجود ہے کہ اس کتاب سے مراد وہ کتاب ہے جس کا کچھ علم آصف بن برخیا کے پاس تھا۔ وہ اس علم کی بدولت ملکۂ بلقیس کے تخت کو یمن سے بیت المقدس میں پلک جھپکنے سے قبل لانے پر قادر ہوئے تھے۔ جس کے بارے قرآنِ مجید میں یہ آیت آئی ہے:

قَالَ الَّذِیْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ اَنَا اٰتِیْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ

يَرْتَدَّ إِلَيْكَ طَرْفُكَ ۚ فَلَمَّا رَآهُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَهُ قَالَ هَٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّي (النمل:۴۰)

"جس کے پاس کتاب کا کچھ علم تھا وہ کہنے لگا: میں آپ کی پلک جھپکنے سے پہلے اُسے آپ کے پاس حاضر کر دیتا ہوں۔ جب (جناب) سلیمانؑ نے تخت کو اپنے پاس نصب شدہ دیکھا تو کہا: یہ میرے پروردگار کا فضل ہے"۔

کتاب سے مراد قرآنِ مجید ہے جو ہر چیز کے لیے بیان ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ (الانعام:۳۸)

"ہم نے اس کتاب میں کسی چیز کی کمی نہیں چھوڑی"۔

جس کسی کے پاس اس کی حقیقت ہوگی تو وہ کائنات کی ہر چیز پر نگران ہوگا۔ جناب آصف بن برخیا اور انبیائے سابقین کے پاس قرآنِ مجید کے علوم کا کچھ حصہ تھا اور حضرت امام علی علیہ السلام ہر اُس علم کے عارف تھے، جو قرآن کے اندر ہیں۔

تھوڑی سی شرح علمِ کتاب کے بارے میں بھی ہو جائے۔ اس کتاب کا علم کیا ہے۔ اس علم سے مراد وہ علم ہے جو حاملِ عمل کو کائنات پر تصرف عطا کرتا ہے اور اُس کے ہاتھ پر خوارقِ عادت امور منصۂ شہود پر آتے ہیں۔ جن کے سامنے متکبرین کی گردنیں جھک جاتی ہیں اور انھیں اپنے عجز کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ پھر وہی ہوتے ہیں جو اقرار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ وہ نہ تو اپنے نفع کے مالک ہیں اور نہ ضرر کے۔

اللہ تعالیٰ نے اس آیت مقدسہ میں کلمہ شہید بیان فرمایا ہے۔ پھر اسی کلمہ کی نسبت اپنی طرف بھی دے دی اور اُسی سیاق میں اُس کی طرف بھی دے دی، جو کتاب کا عالم ہے۔ شہید مبالغہ کا صیغہ ہے، جس کا معنی حضور ہے۔ ایسا حضور جس

میں شدت پائی جائے۔ جو عصمت، احاطت اور اشراف میں بے پناہ صلاحیت کا مالک ہو اور وہ احوال کے دقائق اور ان کے مخفیات پر مطلع ہو۔ اُس کے پاس ہر قسم کی صفات ہوں جس کے ذریعے وہ ہر قسم کے مشاہدات کر سکے۔ کائنات کے رموز اُس کے سامنے ہوں۔ جب یہ تمام مذکورہ صفات اس کے اندر ہوں گی تب جا کر اُسے شہید کہا جا سکتا ہے کیونکہ وہ حقائق و وقائع پر نگاہ رکھتا ہے۔ کیا کوئی ہے اہلِ کتاب میں سے جس پر یہ کلمہ شہید فٹ آئے۔ پھر اُس کی شہیدیت اللہ تعالیٰ کی شہیدیت سے مقرون ہو؟

یہ شہیدیت کیا ہے؟ آیت کے اندر جو مفہوم شہیدیت ہے اُس کے موارد حواسِ ظاہریہ سے تعلق نہیں رکھتے بلکہ ان کے موارد کو ادلّہ عقلیہ سے سمجھا جا سکتا ہے۔ بصیرت ہادیہ سے پرکھا جا سکتا ہے اور اس وجدان سے دیکھا جا سکتا ہے، جو دلیل و برہان سے مربوط ہو۔ اسی حالت کا نام معجزہ ہے۔ جس کو مقامِ تحدی میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

علمِ نبوت کہاں اور اہلِ کتاب کہاں؟ علمِ نبوت کہاں اور عبداللہ بن سلام کہاں؟ بلکہ ہم یوں کیوں نہ کہیں: علمِ نبوت کہاں یہ سارا جہاں کہاں؟

یہ آیت کریمہ اس بات کی طرف ہماری رہبری کرتی ہے کہ اس شہید کی شہیدیت نبوت کے لیے ہے اور جو حقائق و دقائق نبوت ہیں، یہ شہید ان پر بھی نگاہ رکھتا ہے اور ان کے علم کا بھی شرف رکھتا ہے۔ اس کا علم اسی کتاب کے علم سے ماخوذ ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ یہ عالمِ نبوت کے دلائل مکمل نگاہ رکھتا ہے، اس لیے تو اسے نبوت کا شہید مقرر کیا گیا ہے۔

یہ شہیدیت ''جی ہاں'' یا ''جی نہیں'' کے اعلان کے ساتھ حاصل نہیں ہوتی۔ جس طرح کہ ایک عام سی شہادت ہوتی ہے۔ اس امر میں جو متنازع ہو بلکہ یہ وہ شہادت ہے۔ جس کا شہید کتاب کے تمام رازوں پر مکمل عبور رکھتا ہے۔ اس کے یہ حدود

کوئی عام سے نہیں ہوتے بلکہ وہ ان حدود میں شانِ اعجازی رکھتا ہے۔

کیونکہ وہ لوگ جو کافر تھے، انھوں نے نبوت کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کا عزم کر رکھا تھا۔ انھوں نے شدومد کے ساتھ اعلان کر دیا تھا: لَسْتَ مُرْسَلًا تو رسول ہے ہی نہیں کفروشرک کی مکمل طاقت سمٹ کر جب ایک نقطے پر مرکوز ہوئی تو ان کے انکار نے لَسْتَ مُرْسَلًا کا پُرزور نعرہ لگایا۔ صرف نعرہ نہ تھا ہر زاویے سے اعلانِ جنگ تھا۔ یہ کوئی عام مکالمہ نہ تھا۔ اب ضرورت اس امر کی تھی نبیؐ کے ساتھ کوئی ایسا ہو، جو ان منکرین کی گردنوں کو اپنی علمی اور معنوی اعجازیت سے جھکا دے اور ان کی قوتِ انکار کو چیلنج کر دے تاکہ ان کی نجات کی راہیں مسدود ہو جائیں اور انتقام کا جواز پیدا ہو جائے۔ ان کے تمام امور کا مرجع اللہ تعالیٰ سبحانہٗ ہے اور جس کو اُس ذات نے اپنی کتاب کا علم عطا کیا وہ ان لوگوں کے امور پر تولیت رکھتا ہے۔

یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اگر ہم اس تمام بحث کے بعد یہ کہہ دیں۔ اس شہیدیت کا مقصود وہ مقامِ شہادت ہے، جس کو شہادتِ خلق سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس شہادت کا احاطہ اتنا وسیع ہے کہ اُس کے شاہد کو تمام خلق کے حالات اور خصوصیات پر نگرانی حاصل ہو جاتی ہے پھر اس کی شاہدیت اللہ تعالیٰ کی شاہدیت و شہیدیت سے مقرون ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات جو اس عالمِ کتاب کا مصدر فیض و عطا ہے اور اُسی ذات نے ہی اسے یہ عظیم الشان مرتبہ عطا فرمایا کیونکہ اس کا علم اللہ تعالیٰ کی تعلیم سے مربوط ہے۔ پھر اسی عالمِ کتاب کی شہیدیت وہی شہیدیت ہے، جو رسول اللہ ﷺ کے پاس تھی۔ اس شانِ شہیدیت کو قرآن میں یوں تعبیر کیا گیا ہے:

وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (البقرہ:۱۴۳)

''اور رسول تم پر گواہ ہیں''۔

وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا (النساء:۴۱)

''ہم ان سب پر آپ کو بطور گواہ لائیں گے''۔

لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ (الحج:۷۸)

''تا کہ یہ رسول تم پر گواہ رہے''۔

یہ شہید قرآنی شہید ہے اور معصو ہے کیونکہ اس کی ذمہ داری سخت ہے اس لیے کہ معاملہ حق کا ہے اور اللہ اپنے حق میں خلل نہیں چاہتا اور الٰہی معاملات میں وہ مضبوط اور قوی ہے۔ اُس نے شہادت کے حقوق کو ادا کرنا ہے۔ وہ حقائق کی آگاہی پر قدرت رکھتا ہے اور اسرار کائنات پر مطلع ہے اور اللہ تعالٰی کے ملک وملکوت پر اُس کی طرف سے حق ملکیت رکھتا ہے۔

یہ آیت کریمہ منکرین کے لیے چیلنج ہے اور ان کے لیے جہنم کی وعید ہے۔ اللہ کی طرف سے بھی ان کے لیے وعید ہے اور اس کی طرف سے بھی وعید وتحدی ہے جس کے پاس کتاب کا علم ہے کیونکہ اس کے پاس علم ہے، قوت وقدرت ہے۔ اسی اساس پر وہ حق تصرف رکھتا ہے، وہ مقامِ شہیدیت پر فائز ہوتے ہوئے امر صراط کے متولی ہیں اور صراطِ مستقیم کو وہ شخص عبور کر سکے گا جس کے پاس حضرت امام علی علیہ السلام کے آفس سے جاری کردہ ویزہ ہوگا۔ حضرت امام علی علیہ السلام کے آفس شہیدیت سے پُل صراط کے عبور کرنے کا ویزہ اس کے لیے جاری ہوگا، جس نے حق وصداقت کو اپنے اُوپر لازم کیا تھا اور علم اور کلمۂ حق کی سماعت سے انکار نہیں کیا تھا۔ کیونکہ ہر شخص کا معاملہ اسی آفس شہیدیت میں طے پاتا ہے۔ یہ شہید اپنی منزلِ شہیدیت کی بنا پر ہر شخص کے معاملات کا عارف ہے اور معائنہ کرنے والا ہے کیونکہ اس کے پاس کتاب کا علم ہے اور کائنات کی معرفت ہے، چاہے اس کائنات کا تعلق تشریع سے ہو یا تکوین سے ہو۔ وہ سیاست ربانیہ کی ادارت کرنے والے ہیں۔ ان کی یہ ادارت کون ومکان کو اپنے ملکوتی احاطہ میں رکھے ہوئے ہے۔

امام سکول میں

سوال میں ایک اسلامیات کا ریسرچ ہوں۔ میں جناب کے علم سے استفادہ کرنا چاہتا ہوں۔ تاریخ اسلامی کی دنیائے تحقیق میں آپ کا ہی نام ہے، کیونکہ آپ اس میدان میں ایک بہت بڑی شہرت رکھتے ہیں۔ آپ شیعہ امامیہ سے میرے کچھ سوالات ہیں، میں ان کے جوابات چاہتا ہوں۔ میں اہلِ سنت سے تعلق رکھتا ہوں۔ آپ کا عقیدہ ہے کہ آئمہ اہلِ بیت رسولؑ کا علم کسبی نہیں ہے بلکہ وھبی اور لدنی ہے حالانکہ روایات یہ بتاتی ہیں کہ آئمہ اہلِ بیتؑ اپنے زمانۂ طفولیت میں مدرسہ جاتے رہے ہیں اور وہاں مدرسہ کے اساتذہ سے کسب علم کرتے رہے ہیں۔ میرے سامنے جابر بن عبداللہ انصاریؓ کا قصہ ہے۔ جب جابرؓ مدینہ کے ایک اسکول میں جاتے ہیں تو وہاں ایسے مدرسہ میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے ان کی ملاقات ہوتی ہے۔ امامؑ اس وقت طفل تھے اور مدرسہ پڑھنے کے لیے آتے تھے۔ اس نے جب امامؑ کو ان کی جماعت کے بچوں کے ساتھ دیکھا تو ان کی طرف بڑھے اور ان کے مبارک سر کے بوسے لیے اور رسولؐ اللہ کا سلام پہنچایا۔ روایت کچھ اس طرح ہے اس کی وضاحت فرمائیں۔

جواب ہمیں ان احادیث متواترہ کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس صرف اتنا سا کہیں گے جس کسی نے آئمہ اہلِ بیتؑ کے علوم کی معرفت حاصل کرنا ہے تو انھیں چاہیے پہلے حضرت یحیٰؑ اور حضرت عیسٰیؑ علیہم السلام کے علوم کی معرفت

حاصل کریں۔ اگر ان کے علوم سمجھ میں آ گئے تو آئمہ اہلِ بیتؑ کے علوم بھی سمجھ میں آ جائیں گے۔ خداوند تعالیٰ نے جناب یحییٰ علیہ السلام کے بارے میں فرمایا:

وَ اٰتَیۡنٰهُ الۡحُکۡمَ صَبِیًّا (مریم، آیہ ۱۲)

"ہم نے انھیں بچپن ہی سے حکمت عطا کی تھی"۔

جب جناب عیسیٰ علیہ السلام نے جناب مریمؑ کے ہاں ولادت پائی تو وہ جناب عیسیٰؑ کو اُٹھائے ہوئے اپنی قوم کے پاس تشریف لائیں تو قوم نے ان سے پوچھا اور تہمت لگا دی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

فَاَشَارَتۡ اِلَیۡهِ قَالُوۡا کَیۡفَ نُکَلِّمُ مَنۡ کَانَ فِی الۡمَهۡدِ صَبِیًّا ○ قَالَ اِنِّیۡ عَبۡدُ اللّٰهِ اٰتٰنِیَ الۡکِتٰبَ وَ جَعَلَنِیۡ نَبِیًّا

"پس اُسی نے اس بچہ کی طرف اشارہ فرمایا تو انھوں نے کہا: ہم اُس سے کیسے بات کریں جو بچہ ہے اور گھوارے میں ہے؟ بچے نے کہا: میں اللہ کا بندہ ہوں، اُس نے مجھے کتاب دی اور مجھے نبی بنایا ہے"۔ (مریم: ۲۹، ۳۰)

اسی طرح آصف بن برخیا کے علم کے بارے میں قرآنِ مجید میں آیا ہے کہ اس کے پاس کتاب کا کچھ علم تھا۔ انھوں نے علم کی طاقت سے ملکہ بلقیس کا تخت یمن سے بیت المقدس میں پلک جھپکنے سے قبل منگوا لیا تھا۔ انھوں نے یہ علم نہ تو مدرسہ میں پڑھا تھا اور نہ عام لوگوں سے حاصل کیا تھا، جو ان کے زمانے میں ان کے ساتھ زندگی بسر کر رہے تھے۔ اگر وہ ان عام لوگوں سے یہ علم سیکھتے تو پھر وہ لوگ بھی ملکۂ بلقیس کا تخت آصف کی طرف منگوا لیتے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام کو علم کے ہزار ابواب کی تعلیم دی تھی۔ پھر آپ نے ہر باب سے ہزار ہزار باب استنباط فرمائے تھے۔ اہلِ سنت نے روایت

کیا ہے کہ حضرت عمر محدث تھے یعنی ایک فرشتہ ان کے پاس آتا تھا پس وہ اُس سے باتیں کرتے تھے۔ (الاستیعاب، ج ۳، ص ۱۱۴۷)

ان کی روایات میں ہے کہ جناب سلیمانؑ بھی محدث تھے۔ (قاموس الرجال، ج ۵، ص ۱۸۴)

کیا یہ تمام لوگ یہ شان رکھتے تھے اور آئمہ علیہم السلام نہیں رکھتے تھے؟ جہاں تک آپ نے بات کی ہے کہ امامؑ اپنے عہدِ طفولیت میں مدارس میں جاتے رہے ہیں۔ جی ہاں وہ جاتے رہے ہیں، ان کا مدارس میں جانا آئمہ طاہرینؑ کی سیاست کا حصہ تھا۔ اس دور کے حکمران ان الٰہی نمائندوں کا خاتمہ چاہتے تھے اس لیے آئمہ طاہرینؑ نے اس طریقے سے امامت کی حفاظت فرمائی۔ اگر ان ظالموں کو پتہ چل جاتا کہ اس بچے نے آگے جا کر نظامِ امامت چلانا ہے تو وہ اسی وقت حرکت میں آ کر امام کو اُس کے عہدِ طفولیت میں قتل کر دیتے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث ہمارے اس موقف کو مزید تقویت دیتی ہے کہ آپؐ نے فرمایا تھا: "میرے بعد آئمہ، خلفا یا امرا جن کی تعداد بارہ ہے، سب قریش میں سے ہوں گے"۔

یہ حدیث رسولؐ اللہ سے ثابت ہے جس کو اہلِ سنت نے اپنے صحاح میں نقل کیا ہے۔ صحیح بخاری اور مسلم میں یہ حدیث موجود ہے۔ احمد بن حنبل نے اپنی مسند میں روایت کی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہی حدیث موسمِ حج میں منیٰ یا عرفات میں لوگوں کے سامنے بیان فرمائی تھی۔ دیکھیے ہماری کتاب "الغدیر والمعارضون" میں۔

آپ جانتے ہیں ان حکمرانوں نے آئمہ طاہرینؑ کے ساتھ کیا کچھ نہیں کیا۔ اس کے لیے کربلا گواہ ہے اور حضرت امام حسن علیہ السلام کو ان کی زوجہ کے ہاتھ سے زہر

دلوانا یہ سب کام اُس دور کے حکمرانوں کے ہیں، جو آئمہ طاہرینؑ کے دشمن تھے۔

حضرت امام صادق علیہ السلام اپنے سفرِ آخرت کے لیے بالکل تیار تھے۔ ان کی روح ملکوتی اعلیٰ علیین کی طرف پرواز کرنے کے قریب تھی۔ اس وقت کے حکمران نے اپنا نمائندہ امامؑ کے قریب بھیج رکھا تھا کہ امامؑ جس کو اپنا وصی بنائے فوراً اس کی گردن مار دی جائے لیکن منصور اس وقت حیران ہو کر رہ گیا تھا، جب اُس کے نمائندے نے اُسے صورت حال یوں بتائی کہ امامؑ نے اپنا وصی صرف ایک آدمی کو نہیں بنایا بلکہ امامؑ نے پانچ آدمیوں کو اپنا وصی بنایا ہے۔ ان کے اسماء یہ ہیں:

① ابوجعفر منصور ② محمد بن سلیمان ③ عبداللہ بن جعفر ④ موسیٰ بن جعفر اور ⑤ حمیدہ خاتون۔ (بحار، ج ۴۷، ص ۳، والغیبۃ الطوسی، ص ۱۲۹، مناقب آل ابی طالب، ج ۳، ص ۴۳۴، اعلام الوریٰ، ص ۲۹۸)

یہ سن کر منصور نے کہا تھا: میں ان تمام لوگوں کو کیسے قتل کر سکتا ہوں۔ (یہ سب کچھ سیاست آئمہ میں سے تھا۔ منصور امامؑ کے وصیوں کو قتل نہ کر سکا، کیونکہ خود منصور بھی امامؑ کے وصیوں میں سے ایک تھا۔ اگر آپ منصور دوانقی کو شامل نہ کرتے تو ممکن تھا ساتویں امامؑ بچپن میں شہید ہو جاتے۔)

یہ آئمہ طاہرینؑ کا طریقہ رہا ہے کہ جب لوگوں نے اُن سے ان کے بیٹوں کے بارے میں سوالات کیے تاکہ انھیں معلوم ہو جائے کہ وقت کا امامؑ کس نے بننا ہے۔ آئمہؑ نے ان معاملات میں خاموشی اختیار فرمائی تھی حالانکہ خداوند تعالیٰ نے ان کے زمانہ صغر میں اپنے علوم کے ساتھ انھیں مختص کر دیا تھا۔

معصومؑ اور ولایت تکوینیہ

سوال قبلہ حضور! آپ اپنا وقت اور عوام الناس کے قیمتی وقت کو ضائع کر رہے ہیں۔ آج کل لبنانی عوام میں ولایت تکوینیہ پر

پورے شدومد سے بحث ہورہی ہے معلوم ہوتا ہے کہ شاید یہ سب کچھ شیطان کی طرف سے ہو۔ اس بحث نے لبنان کے ہر فرد کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ جس سے لوگوں میں اختلاف پیدا ہورہا ہے۔ علاوہ ازیں وہ ایک غیر اہم کام میں مصروف ہوکر رہ گئے ہیں جس کی وجہ سے ضروریاتِ زندگی متاثر ہوکر رہ گئی ہیں۔ اب ہمیں ضرورت ہے کہ اپنے اور اُمت کے کاموں کی اصلاح کریں۔ اس ولایتِ تکوینیہ کی بحث سے ہمیں کیا فائدہ ہوگا۔ کیا قبر میں ہم سے اس بارے میں پوچھا جائے گا۔ خدارا ہمیں ان مسائل سے بچائیے، ہمارا زمانہ ان مسائل کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ ہماری رہبری ان مسائل کی طرف کریں جو ضروری ہیں، جن سے فرد کا بھی فائدہ ہو اور معاشرے کا بھی۔

جواب برادرِ عزیز! میں نے آپ کے خط کا مطالعہ کیا، جس میں آپ نے اجتماع اور معاشرے کی اصلاح کی بات کی ہے تو مجھے اس سے مسرت ہوئی۔ آپ کے ان جذبات کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ خداوند تعالیٰ سے دعا ہے کہ آپ کی ان کوششوں کو آپ کے میزان اعمال میں جگہ دے، کیونکہ آپ نیک نیت کے مالک ہیں۔ آپ کے جواب کے لیے، کسی طویل بحث کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ کے سوالات کے مطابق جوابات عرض کیے جاتے ہیں۔

① پہلی بات تو یہ ہے کہ ولایتِ تکوینیہ کا مسئلہ ہم نے لبنان میں نہیں پھیلایا۔ یہ مسئلہ السید محمد حسین فضل اللہ کا پھیلایا ہوا ہے۔ انھوں نے اس ولایت کے انکار کا نعرہ لگایا ہے۔ انھوں نے فرمایا: قرآن مجید ولایتِ تکوینی کا ضد ہے۔ انھوں نے ہمیشہ اپنی مختلف کتب میں اس مسئلہ کو زیر بحث رکھا۔ جب بھی لوگوں نے ہماری

طرف اس بحث کو عنوان بنا کر رُخ کیا تو ہم نے اعراض کیا۔

۲ آپ نے جو دوسری بات لکھی ہے کہ دین کے کچھ ایسے موضوعات ہیں کہ ان کی معرفت کوئی فائدہ نہیں دیتی۔ جب فائدہ نہیں تو پھر ان کی تعلیم کا کیا فائدہ؟ جی ہاں! واقعی کچھ ایسے امور ہیں لیکن ان امور میں میری کیا حیثیت اور آپ کی کیا حیثیت۔ ان امور کا واضع اللہ تعالیٰ ہے۔ اللہ تعالیٰ اور اس کا رسولؐ اور آئمہ طاہرینؑ وہ ان معاملات کو خوب جانتے ہیں لیکن وہ امور جو ہم نے سیکھ لیے ہیں اور وہ ہمیں فائدہ دیتے ہیں۔ اب ضروری ہے کہ ہم انھی مسائل کو اپنائیں اور ان پر عمل کریں۔ کسی مقام پر اگر صاحبانِ شریعت خاموش ہیں تو ہمیں بھی خاموش رہنا ہوگا۔ جن اُمور کی ہمیں تکلیف ہی نہیں دی گئی تو ان کے آثار کی ہمیں کوشش ہی نہیں کرنی چاہیے۔

ہم پر واجب ہے کہ وہ بات کریں جو اللہ اور اُس کے رسولؐ نے کی ہے۔ جہاں وہ خاموش ہیں وہاں ہمارا فریضہ بھی خاموش ہے۔ ہم یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ ہم ان سے اعرف ہیں۔ جو حدود ہمارے لیے معین ہوئی ہیں ہمیں ان میں رہنا ہوگا۔

۳ اگر وہ معیار جو آپ نے بیان کیا ہے وہ صحیح ہے کہ جس میں فردی مصلحت ہے یا اجتماعی مصلحت ہے۔ اس کے بیان کی ضرورت نہیں۔ تو پھر آپ بتائیں اللہ تعالیٰ نے اپنے قرآن کریم میں چیونٹی کا ذکر کیوں کیا ہے؟ جب اس کی بات جناب سلیمانؑ نے سن لی تھی۔ اس نے کہا تھا: يٰۤاَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ "اے چیونٹیو! اپنی بلوں میں گھس جاؤ"۔ اس ذکر سے فرد یا معاشرہ کو کیا فائدہ ہوا؟

اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے شہد کی مکھی کی بات کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی طرف وحی کی:

اَنِ اتَّخِذِيْ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا وَّ مِنَ الشَّجَرِ وَ مِمَّا يَعْرِشُوْنَ (النحل:٦٨)

اللہ تعالیٰ نے معراج کی بات کی ہے۔ اس طرح انبیائے علیہم السلام کے معجزات کو بیان فرمایا۔ اس طرح کے اور بیانات ہیں۔

④ مجھے یہ معلوم نہیں کہ آپ نے ولایت تکوینیہ کے موضوع کی بحث سے کیا مراد لیا ہے؟ کیا یہ بحث شیطان کی پھیلائی ہوئی ہے؟ جو کچھ سید فضل اللہ نے اس موضوع پر لکھا ہے یہ سب کچھ شیطان کی وجہ سے ہے؟ کیا اب آپ اس کے رد میں کوشش کرنے والے ہیں؟ کیا حقیقت کو بیان کرنا اور شبہات کو دُور کرنا شیطان کی طرف سے ہوتا ہے؟

⑤ ولایتِ تکوینیہ کے عقیدہ سے ہمیں مقاماتِ انبیاءؑ اور مقاماتِ آئمہ کا تعارف ہوتا ہے۔ یہی عقیدہ ہمارے ایمانی تعلق کو مضبوط کرتا ہے۔ یہ عقیدہ اس طرح اہم ہے جس طرح انبیائے اور آئمہ علیہم السلام کے فضائل کا ذکر اہم ہے۔ خداوند تعالیٰ نے اپنی مخلوق پر انبیائے علیہم السلام کی شاہدیت کو بیان فرمایا ہے، اس کے علاوہ ان کے باقی مقامات کی بھی تشریح فرمائی ہے۔

⑥ ان تمام موضوعات کا اسلوب ایک صحیح اور علمی ہے اور یہ سب قرآنی ادلہ اور احادیث سے ثابت ہیں۔ تو کیا ان کے ذریعے عوام الناس میں اختلاف پھیلتا ہے؟ اگر اختلاف پھیلتا ہے تو کیوں؟ کیا عوام دین اور علم کے دشمن ہیں؟ اگر وہ دشمن ہیں تو اس کی وجوہات کیا ہیں؟ کیا معرفتِ حق اور یہ قضایا دین عوام کو آپس میں متحد کرنے کے لیے نہیں ہیں؟

⑦ برادر عزیز! آپ کا خیال ہے کہ قبر میں ولایتِ تکوینیہ کا سوال نہیں ہوگا لیکن یہ عقیدہ اپنے دامن میں برکات رکھتا ہے۔ اگر آپ یہ عقیدہ نہ رکھیں گے تو آپ اُس کے برکات سے محروم ہو جائیں گے کیونکہ کچھ ایسے عقائد یہ اُمور ہیں۔ اگر انسان ان سے غافل رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ اُسے اس کی اس غفلت پر سزا نہیں دے گا۔ لیکن ان

عقائد سے غفلت انھیں ایک امر عظیم سے محروم کر دیتی ہے۔ زمانہ قریب میں یہی لوگ حسرت کریں گے اور کہیں گے: اے کاش! ہمیں غفلت نے مار دیا ورنہ ہم ان محرومیوں کے شکار نہ ہوتے۔

جو شخص یہ کہتا ہے کہ قیامت کے دن اس امر کے بارے سوال نہیں ہوگا تو اس امر سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ آدمی ان امور سے منکر ہو جائے۔ یہ بات تو معلوم ہے کہ اگر کسی انسان نے عقائد کا انکار کیا تو اس کا مواخذہ کیا جائے گا، کیونکہ وہ عقائد ادلہ قرآنیہ سے ثابت ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے یہ لازم نہیں کیا کہ بحث و تمحیص کے بعد انھیں اپنائیں تو اس کا مقصد یہ نہیں کہ عقائد سے انکار کر دیا جائے۔

مزید توضیح کے لیے عرض کریں گے کہ امر اعتقادی یا تو دلیل کے ساتھ ثابت ہوگا تو اس پر اعتقاد رکھنا واجب ہو جائے گا یا وہ دلیل کے ذریعے ثابت نہیں ہوگا تو اُس سے اپنے آپ کو محفوظ کرنا واجب ہو جائے گا۔ یا پھر نہ تو اس کی صحت ثابت ہوگی اور نہ عدمِ صحت۔ جس طرح کہ اکثر لوگوں کا حال ہے وہ اسی آخری صورت سے دوچار ہوتے ہیں تو پھر ان کے لیے اس امر کا تسلیم کرنا واجب ہو جائے گا۔

یا پھر میں یوں کیوں نہ کہوں جو کچھ اللہ تعالیٰ، اُس کے رسولؐ اور اہلِ بیتؑ نے فرمایا ہے اس کو اپنا عقیدہ سمجھتا ہوں۔ اگرچہ میں ان کی تفصیلات سے ناواقف ہوں اور ان کا انکار جائز نہیں سمجھتا۔

۹ جی ہاں! میں اس امر کی ضمانت لیتا ہوں، قبر میں ولایتِ تکوینیہ کا سوال نہیں ہوگا لیکن میں یہ نہیں جانتا کہ اس عہد کا آپ کو کس طرح اعطا کروں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

أَطَّلَعَ الْغَيْبَ أَمِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ○

"کیا اُس نے غیب کی اطلاع حاصل کر لی ہے یا خدائے رحمٰن

سے کوئی عہد لے رکھا ہے؟" (مریم: ۷۸)

⑩ اے برادر عزیز! میں آپ کو اللہ کی پناہ میں دیتا ہوں، ایمان اور دین کے امور میں تساہل سے بچیں، چاہے وہ مہم ہوں یا نہ ہوں، دین کے تمام امور مہم ہیں۔ جی ہاں! البتہ وہ امر مہم نہ ہوں جس میں فرد یا معاشرہ کے مصالح ہوں، جیسا کہ آپ نے ذکر فرمایا ہے:

اے برادر عزیز! ہم پر نماز و روزہ کو فرض کیا گیا ہے۔ ہمیں جہاد کی تکلیف شرعی دی گئی ہے۔ معاشرہ کی اصلاح کی ذمہ داریاں بھی ہم پر ڈالی گئی ہیں۔ ہم مکلف ہیں کہ ایک دوسرے سے مصافحہ کریں۔ ایک دوسرے کو خوش آمدید کہیں، ایک دوسرے کو سلام کہیں۔ کوئی سلام کرے تو اس کا جواب دیں، ہمیں تکلیف دی گئی ہے کہ ہم دائیں ہاتھ کے ساتھ کھانا کھائیں۔ اب یہ کہنا کہ یہ امور انحرافی ہیں، تو میں کہوں گا آپ غلطی پر ہیں۔ یہ کس طرح ممکن ہے کہ کوئی حدیث وارد ہوئی ہو، جس میں ان امور کا بیان ہو جس سے ایمان کی تکمیل ہوئی ہو اسی امر کو اللہ تعالیٰ، اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، اور آئمہ طاہرینؑ نے بیان فرمایا ہو۔ آخر میں دعا کروں گا اللہ تعالیٰ ہم سب کو اور آپ کو حق پر جمع رکھے اور صدق و صفا پر باقی رکھے اور ہمیں ولایت اہل بیتؑ کی ملکوتی رسی سے تمسک رکھنے والوں میں سے بنائے اور ان کی شفاعت سے ہمارا مقدر قرار دے کیونکہ وہ ولی اور قادر مطلق ہے۔

ہمارا ہر فرد مسموم ہے یا مقتول

سوال جناب شیخ مفیدؒ نے اپنی کتاب شرح عقائد الصدوق، ص ۶۳ میں لکھا ہے کہ شیخ صدوقؒ نے فرمایا ہے: ہمارے نبیؐ اور آئمہ طاہرینؑ جب اس دنیا سے گئے تو زہر کے ذریعے یا تلوار کے ذریعے سے گئے۔ ان میں سے کچھ باتیں تو ثابت ہیں اور

کچھ ثابت نہیں ہیں۔ جو یقینی اور قطعی بات ہے وہ صرف حضرت امیر المومنین امام علی علیہ السلام، حضرت امام حسنؑ اور حضرت امام حسینؑ کی ہے۔ یہ حضرات جب اس دنیا سے چلے تو مقتول صورت میں رخصت ہوئے۔ پھر ان کے بعد حضرت امام موسیٰ بن جعفرؑ اور حضرت امام رضاؑ کے بارے بھی کچھ روایت بتاتی ہے۔ وہ بھی اس دنیا سے مسموم صورت میں رخصت ہوئے۔ حضرت امام رضاؑ کے متعلق جو زہر کی روایت ہے حالات کی رُو سے مضبوط نظر آتی ہے لیکن پھر بھی شک سے خالی نہیں ہے۔ ان کے علاوہ باقی آئمہ طاہرینؑ کے مسموم ہونے کی روایات میں یقین کی منزل نظر نہیں آتی۔ توضیح فرمائیں تاکہ ہم آپ کے علم سے استفادہ کرسکیں۔ شیخ مفیدؒ کی اس روایت کے بارے میں آپ کا کیا موقف ہے؟

جواب جو کچھ شیخ مفیدؒ نے فرمایا ہے۔ آپ نے اس کے بارے میں پوچھا ہے، جس کا تعلق آئمہ اہلِ بیتؑ کی شہادتوں سے ہے۔ آپ کے اس سوال کا جواب یہ ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ شیخ مفید ایک عظیم الشان عالم تھے۔ مذہب حقہ کی حفاظت اور ترویج میں ارفع واعلیٰ مقام کے مالک ہیں۔ خداوند تعالیٰ ان کے درجات میں مزید رفعت پیدا فرمائے۔

شیخ مفیدؒ عباسی دورِ حکومت کے دارالسلطنت بغداد میں رہائش پذیر تھے۔ یہ بات واضح وعیاں ہے کہ بغداد کے حکمرانوں نے آئمہ اہلِ بیتؑ کے قتل میں اپنے ہاتھ رنگین کیے ہیں۔ عباسیوں نے اپنے دورِ حکومت میں آئمہ اہلِ بیتؑ اور ان کے ماننے والوں کو قتل کرنے میں کبھی تساہل سے کام نہ لیا۔ تاریخ نے عباسیوں کے مظالم کو ہمیشہ

کے لیے محفوظ کرلیا ہے۔ اُموی بھی ظالم تھے لیکن ان لوگوں نے اپنے مظالم میں انھیں اپنے پیچھے چھوڑ دیا۔ ہماری کتاب ''امام رضاؑ کی سیاسی زندگی'' کا مطالعہ کریں۔ اس کے اندر تمام تفصیلات موجود ہیں۔

اشارتاً یہ کہوں گا حضرت امام حسین علیہ السلام کا زمانہ اور تھا اور عباسیوں کا زمانہ اور تھا۔ امام حسین علیہ السلام نے ان سے نہ کوئی جنگ کی تھی اور نہ کوئی اور مسئلہ ان کے لیے پیدا کیا۔ امویوں نے اپنی ظلم کی تلوار سے انھیں شہید کر ڈالا تھا۔ عباسیوں نے اُمویوں کے خلاف سازش تیار کی اور امویوں کے خلاف انتقامِ حسینؑ کا نعرہ لگایا اور اس طرح امویوں کو شکست دی اور اپنی حکومت کی داغ بیل ڈالی۔ جب ان کی حکومت قائم ہوگئی تو انھوں نے پھر کیا کچھ نہیں کیا۔ حضرت امام حسین علیہ السلام امام تھے، معصوم تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد اپنے برادر اور بابا کے ساتھ کائنات کے افضل ترین اور مقدس ترین ہستی تھے۔ عباسیوں نے آپ کے روضہ کو گرا دیا اور ہل چلوائے۔ اردگرد جو درخت تھے انھیں کٹوا دیا۔ منصور عباسی ہو یا ہارون رشید، متوکل ہو یا ان کا کوئی اور، انھوں نے کربلا کے تمام راستوں کو بند کر دیا تھا تاکہ کوئی زائر کربلا نہ پہنچ سکے۔ زائرین پر مظالم ڈھائے گئے، انھیں قتل کیا گیا، ان لوگوں نے قبرِ حسینؑ کے ساتھ یہ سلوک کیا جو ابھی بیان ہوا ہے اور زائرین حسینؑ کے ساتھ جو سلوک کیا وہ بھی بیان ہو چکا ہے۔

تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے جب عباسیوں نے اہلِ بیت رسولؐ پر اپنے مظالم کا آغاز کیا تو اہلِ بیتؑ اور دنیا کو اُموی مظالم بھول گئے۔ انھیں حالات پر نظر رکھنے والے شاعر نے کہا تھا:

تَاللّٰهِ مَا فَعَلَتْ اُمَيَّةُ مِنهُم
مِعْشَارَ مَا فَعَلَتْ بَنُوعَبَّاس

''بخدا اہلِ بیت رسولؐ پر جو مظالم اموی نے ڈھائے تھے وہ

بنو عباس کے مظالم کا عشر عشیر بھی نہ تھے"۔

ان حالات کے تناظر میں یہی کچھ عرض کریں گے حضرت شیخ مفید علیہ الرحمہ اس دور حکومت میں زندگی بسر کر رہے تھے، جن کے حکمرانوں کو ان کے اسلاف سے اہلِ بیت رسولؐ اور ان کے ماننے والوں کے خلاف بغض و کینہ ورثے میں ملا تھا۔ جو کچھ روایات ہمیں بتاتی ہیں کہ آئمہ اہلِ بیتؑ کو طبعی موت نہیں آتی تھی بلکہ وہ زہر سے یا تلوار سے اس دنیا سے رخصت ہوئے تھے۔ صحیح ہے اس میں کوئی شک ہی نہیں۔

عباسی حکومت رکھتے تھے، بہت بڑی فوج رکھتے تھے۔ اس دور کی سیاست پر چھائے ہوئے تھے۔ سب کچھ ان کے ہاتھ میں تھا۔ انھوں نے اپنے درباروں میں تاریخ لکھوائی اور جو کچھ پسند کیا تحریر کرایا تاکہ نئی نسل تک وہ امور پہنچیں جو انھیں پسند تھے۔ اور وہ حقائق نہ پہنچیں جن سے آنے والی نسلیں ان سے نفرت کرنے لگیں۔ اس دور کے وہ لوگ انھیں ناپسند تھے جو اہلِ بیتؑ سے محبت و عقیدت رکھتے تھے۔

اُمویوں نے حضرت امام حسین علیہ السلام، حضرت زید اور حضرت یحییٰ کو شہید کر ڈالا تھا۔ ان کی مستورات کو اپنا قیدی بنا کر در بدر پھرایا تھا لیکن اتنے بڑے مظالم کے بعد کیا انھوں نے اس دور کے لوگوں کو اجازت دی تھی کہ ان کے مظالم کو کھلے عام بیان کیا جائے؟ بلکہ انھوں نے وہ کیا، جو اُن سے بن آیا کہ ان مظالم پر پردہ ڈالا جائے اور ان کی بے گناہی بیان کی جائے۔

آپ کا کیا خیال ہے عباسی اپنی سفاکیت کا اعتراف کرتے پھرتے کہ انھوں نے آئمہ اہلِ بیتؑ کو زہر سے اس دنیا سے رخصت کیا ہے؟ وہ زہر سے قتل بھی کرا دیتے تھے اور اپنی برأت کا اعلان بھی کرا دیتے تھے کہ ان کی موت طبعی موت ہے، کوئی حکومتی سبب نہیں ہے۔

میں آپ کو دعوت دیتا ہوں آپ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام اور امام رضا علیہ السلام کی

تاریخ پڑھیں۔ عباسی حکمرانوں نے انھیں زہر سے شہید کرایا۔ پھر لوگوں کو یہ باور کرایا کہ ان کی موت زہر سے نہیں ہوئی بلکہ ان کی موت طبعی ہوئی ہے۔ پھر ان کے جنازوں کے ساتھ چلے، ان کے اجسام سے کفن کھلوا کر لوگوں کو دکھلایا تا کہ ان کے جرائم پر پردہ پڑ جائے۔

اس دور کے یہ تمام عوامل شاہد ہیں کہ آئمہ طاہرینؑ کی شہادتوں پر پردہ ڈالنے کی بھرپور کوشش کی گئی۔ جہاں ایک ریاست متحرک ہوجائے تو وہاں حقائق تک عوام کی رسائی مشکل ہوجاتی ہے۔ اسی ظالم دور میں شیخ مفیدؒ زندگی بسر کر رہے تھے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگر ہم فرض کریں کہ آئمہ طاہرینؑ کی شہادت کا واقعہ اس دور میں مدون ہوگیا ہو لیکن سوال یہ ہے کہ کیا شیخ مفیدؒ کو اس دور کی ان مخصوص تالیفات تک رسائی حاصل تھی کہ آپ ان تالیفات کو جواُن کے زمانے سے قبل لکھی گئی تھیں جمع کرنے پر قادر تھے۔ اس دور میں نقل وحمل کے ذرائع نہ ہونے کے برابر تھے۔ اگر تھے تو بڑے مشکل تھے۔ نہ وہ زمانہ ٹیلی فون کا تھا اور نہ موبائل کا اور نہ سیٹلائٹ نظام تھا۔ اس دور میں کتب قلم کے ساتھ لکھی جاتی تھیں۔ پریس کا زمانہ نہیں تھا۔ کتب کی تعداد نہایت ہی قلیل تھی۔ اس دور کے لوگ سماعت پر اکتفا کرتے تھے۔ کسی سے روایت سنی اور اُسے حفظ کرلیا۔ آگے دوسرے لوگوں تک وہ روایت پہنچا دی۔

اس زمانے کو آج کے زمانے پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ اس دور کے لوگ جو پڑھے لکھے تھے، ان کی تعداد نہایت ہی قلیل تھی۔ مزید برآں اس دور کے لوگوں کے مالی وسائل بدحالی کا شکار تھے۔ بھوک و افلاس کا غلبہ تھا۔ اس دور کی زندگی حیران و پریشان تھی کیونکہ ضروریاتِ زندگی کا دُور دُور تک نشان نہیں ملتا تھا۔ جب انسان معاشی طور پر اتنا بے بس ہو تو تعلیم اور کتب کا اس کے لیے تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔ اُسے

روزی کمانے سے فرصت نہ ہو تو ایسے انسان کے متعلق کتابوں کا خریدنا اور پھر ان کا مطالعہ کرنا عجیب سا لگتا ہے۔ ان حالات کے ساتھ ساتھ حکومت وقت بھی مخالف ہو، سرکاری ادارے بھی متحرک ہوں کہ وہ خبر جو حکمرانوں کو ذلیل کر سکتی ہے وہ عوام الناس تک نہ جانے پائے تو کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ ادھر امامؑ کو زہر ملے اور وہ شہید ہو جائیں اور لوگوں کو علم بھی ہو جائے۔

کیا شیخ مفید ان تمام مؤلفات کے حصول پر قادر تھے؟

میری بات یہ ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں علمائے متاخرین نے کتب کے جمع کرنے میں بے پناہ کوشش کی۔ اُنھوں نے دُور دراز کے ممالک سے بھی کتابیں منگوائیں اور ان کا ذخیرہ بنایا۔ لیکن یہ کتب سیکڑوں سال عوامی دسترس سے دُور رہیں، انھیں چھپا کر رکھا گیا تھا۔

ان کتب کو کیوں چھپایا گیا؟ تو اس کے مختلف عوامل ہو سکتے ہیں۔ تقیہ کیا گیا تھا یا پھر ظالم حکمرانوں کے خوف سے ان علمی نوادرات کو منظر عام پر نہ لایا گیا۔

ہمارے اس زمانے میں جو کتب موجود ہیں، ان کے مؤلفین نے اپنی کتب کے مصادر پر مطلع کیا ہے لیکن ان مصادر تک ابھی تک ہماری رسائی نہیں ہوئی۔ حالانکہ ہمارے زمانہ میں جدید ترین وسائل موجود ہیں جن کے ذریعے ہم جس کتاب کو چاہیں تو حاصل کر سکتے ہیں۔

کیونکہ اس جدید دور کے جدید وسائل کے ذریعے مختلف معلومات تک انسان کی رسائی ممکن ہو چکی ہے۔ ہر نوع کے مصادر سے استفادہ کیا جا سکتا ہے اور ان کے ذریعے اکمل درجہ کی تحقیقات کی جا سکتی ہیں کیونکہ گذشتہ ادوار کی تحقیقات صواب تک پہنچنے کے لیے ناکافی ہیں۔

آخری بات یہ ہے، جو کچھ ابھی تک ہم نے بیان کیا ہے شیخ مفید کی وہ روایت

جو ہمارا موضوع رہا ہے۔ جو کچھ انھوں نے فرمایا ہے وہ تقیہ کی بنیاد پر نہ بھی ہو لیکن ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ آئمہ اہلِ بیتؑ کی شہادت جو زہر کے ذریعے ہوئی جن کے بارے میں انھوں نے بیان کیا کہ امام علی علیہ السلام اور امام حسین علیہ السلام کی شہادتیں تلوار کے ذریعے ہوئیں۔ حضرت امام حسنؑ و حضرت امام کاظمؑ، حضرت امام علی رضاؑ کی شہادتیں زہر کے ذریعے ہوئیں اور باقی آئمہ کی شہادتوں کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ان کا یہ کہنا بتاتا ہے کہ ان کے پاس اس موضوع پر زیادہ معلومات نہ تھیں۔

المختصر! شیخ مفید علیہ الرحمہ کو اس موضوع پر یہ کہنا چاہیے تھا۔ میں نے کہیں نہیں پایا، ان کو یہ نہیں کہنا چاہیے تھا کہ میرے پاس اس امر میں یقین کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ کیونکہ عدمِ وجدان عدمِ وجود کی دلیل نہیں ہے (یعنی ایک انسان ایک امر کو نہیں سمجھتا تو اُس کے نہ سمجھنے سے وہ امر معدوم نہیں ہو جاتا)۔

آخر میں یہ عرض ہے: امر باقی رہتا ہے، انسانی رسائی محدود ہوتی ہے کہ جو قول انھوں نے فرمایا ہے، اس پر اکتفا کرنا صحیح نہیں ہے۔ ان کے اس قول سے امر حقیقی کی نفی نہیں ہو جاتی۔ ہمیں یہ حق بھی حاصل نہیں ہے کہ ہم نے اپنے استدلال سے شیخ مفید علیہ الرحمہ کے کلام پر نقض وارد کر دیا۔ درحقیقت وہ نصوصِ عامہ ہیں جو ہم نے ابتدائے بحث میں عرض کی تھیں جیسے مَا مِنَّا اِلَّا مَقْتُوْلٌ اَوْ مَسْمُوْمٌ یا وہ نصوصِ خاصہ جن میں ہر امامؑ کی خصوصیات کا ذکر موجود ہے کہ ان کی شہادت کس طرح واقع ہوئی۔ مؤلفات اور مصادر کی طرف رجوع فرمائیں۔

حضرت امام حسین علیہ السلام کا اپنے دشمنوں کے لیے گریہ کرنا

سوال کچھ ایسے سوالات و اشکالات ہیں، جو منبر پر بیان ہوتے ہیں جن سے عام ذہن پریشان ہو جاتا ہے۔ میری التجا ہے آپ ان سوالات کے جوابات مرحمت فرمائیں۔

۱ بعض مصادر میں بیان ہوا ہے کہ حضرت امام حسین علیہ السلام نے عاشورا کے دن اپنے دشمنوں پر گریہ فرمایا۔ بعض دوستوں نے اعتراض کیا اور انھوں نے قرآن مجید کی آیت کے ذریعے اپنے موقف پر دلیل قائم کی کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: جب زانی اور زانیہ پر حد قائم کی جائے تو ان کے لیے کسی لحاظ سے نرمی کا سلوک نہ کیا جائے۔ جب اللہ نے اپنے نافرمانوں پر رحم ورافت جائز قرار نہیں دیا تو پھر حضرت امام حسین علیہ السلام اپنے دشمنوں کے لیے کیوں نرم ہوئے اور پھر ان پر کیوں گریہ کیا حالانکہ وہ آپؑ کی جان کے دشمن تھے؟

۲ بعض مصادر میں آیا ہے جیسا منتخب طریحی، ص ۳۵۱، ذریعۃ النجاۃ، ص ۱۳۵ اور خصائص حسینیہ میں امام حسین علیہ السلام نے اپنے اعداء سے فرمایا تھا:

اَلْاٰنَ اِسْقُوْنِی قَطْرَةً مِنَ الْمَاءِ فَقَدْ تَفَتَّتَتْ کَبِدِیْ

”مجھے ایک قطرہ پانی پلا دو، میرا جگر پھٹا جا رہا ہے“۔

بعض نے اعتراض کیا کہ حضرت امام حسین علیہ السلام ایک غیور امام تھے، ان کے لیے یہ سوال اچھا نہیں تھا کہ وہ اپنے دشمنوں سے پانی کا سوال کریں؟

جواب آپ کا پہلا سوال کہ یوم عاشورا حضرت امام حسین علیہ السلام نے اپنے قاتلوں پر گریہ فرمایا۔ تو اس کے جواب میں عرض کریں گے:

۱ حضرت امام حسین علیہ السلام خاندانِ نبوت کے چشم و چراغ تھے۔ خداوند تعالیٰ نے اپنے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اپنے قرآن کریم میں خطاب فرمایا:

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا ۝ (الکہف:۶)

"پس اگر یہ لوگ (قرآنی) مضمون پر ایمان نہ لائے تو ان کی وجہ سے شاید آپ اس رنج میں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں"۔

ایک دوسرے مقام پر فرمایا:

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۝ (الشعراء:۳)

"شاید اس رنج سے کہ یہ لوگ ایمان نہیں لاتے آپ اپنی جان کھو دیں"۔

ایک اور مقام پر خطاب خداوندی ہے:

فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرٰتٍ (الفاطر:۸)

"پس ان لوگوں کے افسوس میں آپ کی جان نہ چلی جائے"۔

پیغمبر اکرم ﷺ نے اپنے دور کے ان فرعونوں سے دفاعی جنگیں لڑیں اور انھیں قتل کیا لیکن آپؐ نے حسرت فرمائی۔ کاش کہ یہ لوگ حق کو قبول کرتے اور یوں برباد نہ ہوتے۔ اس کے علاوہ بہت سی آیات ہیں، جو اسی مفہوم کو ادا کرتی ہیں۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ اگر حضرت امام حسین علیہ السلام نے اپنے نانا کی اقتداء میں اپنے قاتلوں پر حسرت کی کہ وہ تو اپنے نانا کی سنت پر چلنے والے تھے۔

۲ یہاں ایک کافر اور مجرم پر رافت و رحمت کے جذبات رکھنا اور ایک مسلم مرتکب خطا کے درمیان فرق ہے۔ کافر کے لیے یہ جذبہ رحم اس لیے ہے کہ اس نے حق و حقیقت کو قبول کیوں نہ کیا جس کے نتیجے میں ہمیشہ کے لیے جہنم کا ایندھن بن گیا اور ایک مسلم مجرم کے لیے رحم کے جذبات نہ رکھنے کا اس لیے حکم ہے کہ یہ تو مسلم تھا اور اس پر جنت واجب تھی اور اس نے حق کو ضائع کیا اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی

نافرمانی کی تو اسے سزا بھی ملے اور اس کی محبت میں تخفیف بھی ہو تا کہ معاشرہ اسلامی میں ایسے مجرمین کی حوصلہ شکنی ہو۔ مزید ایسے جرائم پیدا نہ ہوں۔

اس لیے "فی دین اللہ" کی قید کے ساتھ فرمان جاری ہوا کیونکہ دین خداوندی میں جس "رافت" کی بات کی گئی ہے وہ "رقت" ہے۔ ایسا انسان مطلوبہ مدارج سے تنزل کی طرف آیا ہے اور اُس سے احکامِ خداوندی میں تساہل ہوا ہے۔ امام حسین علیہ السلام اپنے دشمنوں پر حد جاری نہیں کر رہے تھے اور نہ آپ کو یہ پسند تھا کہ ان کے قاتلوں کے اُخروی عذاب میں تخفیف ہو۔ آپؑ کی خواہش یہ تھی کہ وہ ہدایت ربانی پر ہوتے اور گمراہ نہ ہوتے۔ اس لیے آپؑ نے ان کے اعمال پر حسرت کی۔ جب ان لوگوں نے اپنے جرائم کا ارتکاب کرلیا اور حرماتِ الٰہی کی ہتک کر ڈالی تو حضرت امام حسین علیہ السلام نے ان کے اُخروی عذاب میں تخفیف کی دعا نہیں فرمائی۔

دوسرے سوال کا جواب یہ ہے:

① یہاں کچھ وجوہات ہیں، جن پر قرائن احوال روشنی ڈالتے ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں:

(-حضرت امام حسین علیہ السلام نے ان اشقیاء سے پانی کا سوال کر کے ان پر اتمامِ حجت کر دی، کہ ان تمام لوگوں پر حجت قائم ہوئے تا کہ کل کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ اُسے امامِ وقت کی پیاس کا علم نہ تھا۔ آپؑ نے اپنے اس سوال سے ہر غافل کو متنبہ کر دیا۔ اگر کوئی غافل تھا تو اس کی غفلت کو دُور کر دیا تا کہ وہ اس معاملے میں معذور نہ رہیں۔

ب- حضرت امام حسین علیہ السلام چاہتے تھے کہ وہ ان کی معرفت حاصل کریں۔ آپؑ ان پر روتے بھی تھے اور حسرت بھی کرتے تھے اور وہ آپؑ کو قتل کر رہے تھے۔

دوسری بات یہ ہے کہ پانی کا سوال ایک انسان کا فطری اور طبیعی حق ہے۔ کیا

حق نہیں مانگا جاسکتا؟ اور یہ حق وہ حق ہے، جس کی شریعت نے بھی حفاظت کی ہے، اخلاق نے بھی حفاظت کی ہے۔ مزید برآں مانگنے والے امام ہیں۔ وہ امامت کا حق بھی رکھتے تھے اور انسانی حق بھی رکھتے تھے۔

آخری بات یہ ہے حضرت امام حسین علیہ السلام ہدایت ربانی کے تمام وسائل کو میدانِ کربلا میں استعمال کر رہے تھے تاکہ ان میں سے کچھ لوگ کسی وسیلے سے متاثر ہوجائیں اور ہدایتِ ابدی کی منزل پر پہنچ جائیں کیونکہ آپؑ ہدایتِ ربانی پر مسئول تھے۔ آپؑ ان تمام لوگوں کی ہدایت چاہتے تھے تو آپؑ کے لیے ضروری تھا کہ آپؑ ان پر ہدایت کے دروازوں کو کھولیں۔ اس لیے آپؑ نے یہ آواز بلند کی کہ تھوڑا سا پانی چاہیے۔ یہ ایک ندائے انسانی تھی جو مشاعر انسانی کے موافق تھی اور فطرتِ انسانی کو تڑپا دینے کے لیے کافی تھی۔

سیرتِ حسینیؑ کے معتبر مصادر

سوال جب سیرتِ حسینیہ کے بارے میں کہا گیا ہے کہ سیرتِ حسینیہ کو ان مصادر سے لینا چاہیے جو معتبر ہیں۔ اس معاملے میں جناب کی کیا رائے ہے۔ منبرِ حسینیؑ کے واعظین صحیح مصادر سے بیان کرنے کی نصیحت کیوں نہیں کرتے؟

جواب امابعد! ① سیرتِ حسینیہ کے مصادر کثرت کے ساتھ موجود ہیں۔ انھی مصادر میں سے کتبِ حدیث بھی ہیں جیسا کہ امالی شیخ صدوق ہے، امالی شیخ مفید ہے۔ اس طرح البحار بھی نصوصِ معتبرہ سے بھری پڑی ہے جو معتبرہ مصادر سے لی گئی ہیں۔ ہاں کچھ اختلاف کے ساتھ۔ اسی طرح یہی نصوص مختلف اسلامی مصادر میں موجود ہیں۔ کتبِ حدیث، کتبِ ادب، کتبِ انساب، کتبِ بلدان یہ سب انھی مصادر کا حصہ ہیں جو کچھ کربلا میں ہوا یا کربلا کے واقعہ سے پہلے ہوا یا بعد، تمام احوال انھی میں موجود ہیں۔

جناب سید عبدالرزاق مقرم نے کربلا کے واقعات و حالات کو تفصیل کے ساتھ لکھا ہے اسی طرح متاخرین نے بھی مقتلِ حسینؑ کے نام سے کتابیں لکھی ہیں جیسا کہ ابن طاوؤس اور ابن نما ہیں۔

۲ بعض اُمور جو قابلِ نفرت ہوتے ہیں، نہ صرف ان کی تردید کی جائے بلکہ ان پر خط بطلان کھینچ دیا جائے کیونکہ یہ اذہان کی پیداوار ہوتے ہیں، جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ وہ اپنی طرف سے گھڑ لیتے ہیں۔ آخر ایسا کیوں ہوا ہے اور کیوں ہو رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی طرف سے انھیں روکا نہیں جاتا۔ لیکن یہ معاملہ معمولی نوعیت کا نہیں ہے کیونکہ یہ لوگ ان من گھڑت واقعات کو مقاماتِ اولیاء اور مقاماتِ اوصیاء سے مربوط کرتے ہیں۔

اس لیے ضرورت اس امر کی ہے، ایسے واقعات جو صرف اور صرف مفروضوں پر مبنی ہیں، جن کا حقائق سے تعلق نہیں ہے۔ جو توہین کا سبب بنتے ہیں جہاں سے بنتے ہیں۔ ان مقامات کی اصلاح کی جائے تاکہ مقاماتِ اولیاء اور اصفیاء کی توہین کے پہلو ہمیشہ کے لیے مفقود ہو جائیں۔ ایسی تربیت کی جائے جس سے ایمان و روحانیت کی آبیاری ہو اور لوگ ایسے امور سے بچ جائیں، جن سے توہین کے پہلو نکلتے ہیں۔ میری خواہش یہ ہے عوام کو ایسی معلومات دی جائیں جو حضرت امام حسین علیہ السلام کے عظیم الشان جہاد سے مربوط ہوں۔ اور پھر عوام الناس میں اس عظیم الشان جہاد کی روح پیدا ہو۔

۳ ہمارا فریضہ بنتا ہے کہ منبر حسینیؑ کے تقدس کا خیال رکھیں اور لوگوں کو شکوک و شبہات میں نہ ڈالیں۔ ایسی روایات جو من گھڑت ہوں ان کو بیان کرنے سے بچیں، اس کے علاوہ کسی قسم کی تحریف بھی جائز نہیں ہے۔ اگر ہم ان خرافات کے سامنے خاموش رہے تو پھر ہمارا شمار بھی منبر حسینیؑ کے تقدس کو پامال کرنے والوں میں ہوگا۔ کیونکہ یہ خرافات اور اختراعات دین خداوندی کی مخالفت ہے اور عملِ عاشورا پر ظلم عظیم

ہے۔ یہ مواقع جو توہین آمیز ہیں اور جو آئے دن دیکھنے میں آتے ہیں ان کی وجہ یہ ہے کہ یہ مجالس پڑھنے والے عوام کو جاہل سمجھتے ہیں۔ نہ ان کے سامنے اخلاق ہوتا ہے اور نہ دین، بس ان کا زور صرف اس بات پر ہوتا ہے کہ وہ اپنی خرافات کو مزین کر کے عوام کو پیش کریں اور ان سے داد وصول کریں۔

اس حقیقت سے بھی انکار نہیں ہے، ان بے چاروں نے جن کو عوام نے اپنے منبر پر بلایا ہوتا ہے۔ وہ بھی سنی سنائی بات کرتے ہیں کہ فلاں سے سنا ہے یا فلاں کتاب میں پڑھا ہے۔ کیونکہ یہ خود بھی علم سے دُور ہوتے ہیں اور سننے والے بھی، جن کو یہ روضہ خوان سرے سے جاہل جانتے ہیں۔ اس لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ ایسے خطبا پیدا ہوں، جو ثقہ ہوں تاکہ منبر حسینؑ کے یہ نقائص دُور ہوں کیونکہ ایمانی ثقافت ہی سے ان خرافات پر قابو پایا جاسکتا ہے۔

مثال کے طور پر اگر کوئی خطیب یہ بیان کرتا ہے کہ میدانِ کربلا میں حضرت امام حسین علیہ السلام نے اعداء دین پر دس حملے کیے اور ہر حملے میں دس ہزار آدمی قتل کیے حالانکہ میدانِ کربلا میں یزیدی لشکر تقریباً تیس ہزار نفر پر مشتمل تھا۔ وہ تین لاکھ نفر نہیں تھے۔ یہ سب خرافات ہیں اور جھوٹ ہیں، جن کا حقیقت سے دُور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ ہم سب پر واجب ہے کہ ان امور کی طرف متوجہ ہوں اور ان کی اصلاح کریں۔

اس سارے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ اکثر لوگ جان بوجھ کر اس مقدس منبر حسینؑ سے سوئے استفادہ کرتے ہیں، جس طرح بعض لوگ نماز سے سوئے استفادہ کرتے ہیں تاکہ لوگ دھوکے میں آئیں اور انھیں نمازی خیال کریں۔ جب ان کے دھوکے کی قلعی کھلتی ہے تو سارے نمازیوں تک وہ نسبت جاتی ہے، جو اس سے منسوب ہوئی۔

۞ اس لیے ضرورت ہے کہ ان خرافات کا ابھی سے قلع قمع کردیا جائے۔ یہ

عمل عاشورا کے لیے ایک بہت بڑا حادثہ ہے۔ اگر ابھی سے اس کے آگے بند نہ باندھا گیا تو پھر یہ آگے چلے گا اور آنے والی نسلوں کو تباہ کر کے رکھ دے گا۔

خداوند تعالیٰ نے اس مقدس خون کی حفاظت فرمائی ہے تاکہ دین اسلام کی حفاظت کا وسیلہ بن جائے۔ اس لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا:

ان الحسین مصباح الھُدیٰ وسفینۃ النجات

"حسینؑ ہدایت کا چراغ ہیں اور نجات کا سفینہ ہیں"۔

۵ جب ہم لوگ انھی خرافات اور اختراعات کو پیش کرتے ہیں تو پھر انھی کو تسلیم کرانے کی کوشش کرتے ہیں۔ بعدازیں وہ اسلوب اپناتے ہیں جو اساسی موضوع سے ہی خارج ہوتا ہے۔ پھر ان حالات کو سامنے رکھیں تو نتیجہ آپ کے سامنے آجائے گا، یعنی ہم حقائق سے بہت دُور چلے جائیں گے اور شکوک وشبہات کو جنم دیں گے۔ تو یہ کتنا بڑا جرم ہے بلکہ جرائم کا ایک تسلسل شروع ہوتا ہے جو ختم نہیں ہوتا۔

وہ مقدس خون جس کو حسد اور شر کی تلواروں نے میدانِ کربلا میں بے دردی کے ساتھ بہا دیا تھا، وہ تلواریں جن ہاتھوں میں تھیں وہ مجرم ہیں اور یقیناً مجرم ہیں اور اس دور میں وہ لوگ جو منبرِ حسینیؑ پر روحِ حسینیؑ کے خلاف کام کرتے ہیں تو وہ بھی مجرم ہیں۔ کربلا کے حقائق سے ہٹ کر بات کرتے ہیں وہ بھی مجرم ہیں۔

۶ آہ و بکا کا تعلق انسانی شعور کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ جب انسانی وجدان بیدار ہوتا ہے اور ضمیر زندہ ہوتا ہے تو ہر اُس واقعہ پر رونا آجاتا ہے، جو درد انگیز ہوتا ہے۔ یہی وجدانی حیات اور ضمیر کی بیداری منبرِ حسینیؑ سے پیدا ہوتی ہے اور یہی کیفیت ایمان کی بنیادوں کو مضبوط کرتی ہے۔

ایسی فکر جو خشک ہوتی ہے، وہ قلبِ انسانی کو تحریک نہیں کرسکتی۔ نہ اُس میں جذبہ قربانی ہوتا ہے اور نہ عطوفت ہوتی ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ انسان سے یہی کچھ چاہتا

ہے کہ وہ کسی کے لیے تڑپے اور اُس کی مدد کرے۔

حضرت امام حسین علیہ السلام کی عظیم الشان قربانی ہمیں اس بکا پر تحریک کرتی ہے کیونکہ ان کی عظیم الشان جدوجہد اور قربانیوں کے احوال سننے اور پڑھنے کے ساتھ ضمیر کو زندگی ملتی ہے اور وجدان کو غفلت کی قید سے آزادی کا پروانہ بھی۔ اس انداز کے موضوعات اپنا خاص اثر رکھتے ہیں جس طرح حضرت ابراہیمؑ کا اپنے بیٹے جناب اسماعیلؑ کو ذبح کرنا لیکن خداوند تعالیٰ نے انھیں ذبح ہونے سے بچا لیا تھا۔ اس طرح حجر بن عدی اور ان کے بیٹے کی دردناک شہادت ہے اور اس طرح کربلا کے احوال ہیں۔

﴿۷﴾ ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم جب منبر حسینیؑ سے خطاب کرنا چاہیں تو اس خطاب کے ذریعے سامعین کی اسلامی، ثقافتی اور عقائدی تربیت کریں اور انھیں دین کے حقائق سے آگاہی دیں۔ کیونکہ دین اسلام سیاسیات، اقتصادیات، عبادات اور اخلاقیات کی مضبوطی کا درس دیتا ہے اور حکمت الٰہیہ عطا کرتا ہے اور بندے کو معبودِ برحق کے قریب کرتا ہے۔

ہم پر ضروری ہے کہ ہم منبر حسینیؑ پر صرف اور صرف آئمہ اہلِ بیتؑ کے روایتی تعارف پر اکتفا نہ کریں بلکہ اس تعارف کے ساتھ ان کی بھرپور زندگی لوگوں کے سامنے رکھیں کہ انھوں نے اپنی زندگی میں اپنے پروردگار کی کتنی عبادت کی۔ انھوں نے کس طرح حکومتی نظام کو منظم کیا، ان کے اخلاقیات کیسے تھے؟

اس بات کی بھی اشد ضرورت ہے کہ ہم اسٹیج منبر حسینیؑ سے عوام الناس کی دینی اخلاقی اور عبادی تربیت کریں۔ جو کچھ ہماری کتاب الکافی میں ہے، البحار میں ہے ان کی روایات کو اپنائیں اور عوام الناس کو سنائیں کہ معصومینؑ نے ہماری تربیت کے لیے کیا کچھ فرمایا۔ انھوں نے اس کائنات کے بارے میں، اس آسمان کے بارے میں،

اس زمین کے بارے میں، اس دنیا کے بارے میں، اور آخرت کے بارے میں کیا کیا اقوال جاری فرمائے۔

سامعین کو ان اُمور سے آگاہی دی جائے، جو ان کے لیے ضروری ہیں اور حسینی ورثے کے حقائق جو عام طور پر بیان نہیں کیے جاتے وہ بیان کیے جائیں جن سے کربلا کی عظیم الشان تحریک سامنے آئے اور اہلِ بیتؑ کا موقف واضح ہو۔

⑧ محرم میں نصوص معینہ کی روشنی میں عاشورا کے احوال بیان کیے جائیں جن کی عام طور پر عوام کو ضرورت ہے۔ منبر حسینیؑ کی یہی عظیم الشان خدمت ہے۔

⑨ ایک اور لازمی امر جس کی اشد ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ ہم دوسروں کے افکار پر پہرے نہ لگائیں۔ ہر ایک کو اجازت دیں کہ وہ بھی سوچ بچار کریں، آنے والی نسلوں کو اس حق سے محروم نہ کریں۔ خداوند تعالیٰ آپ کو توفیق عطا کرے۔ حق اور خیر کی راہوں کی رہنمائی عطا کرے۔

حضرت عبداللہ ابن عباس، حضرت محمد بن حنفیہ اور کربلا

سوال ① ا۔ حبرُ الامت عبداللہ بن عباس اور محمد بن حنفیہ نے امام حسین علیہ السلام کی نصرت میں جنگِ کربلا میں کیوں شرکت نہیں کی؟

ب۔ حضرت عبداللہ بن جعفر نے شہادتِ امام حسین علیہ السلام کے بعد اور حضرت عبداللہ بن عباس نے کیا کردار ادا کیا؟

② بہت سی روایات میں آیا ہے کہ حضرت قائم عجل اللہ الشریف کے قیام سے قبل جو پرچم بلند ہوگا تو اس کا بلند کرنے والا طاغوت ہوگا وہ اللہ کے غیر کی عبادت کرے گا یا پھر وہ پرچم ضلال و گمراہی ہوگا۔ الخ۔

کیا یہ روایات جہادِ اسلامی سے موافقت رکھتی ہیں حالانکہ جہاد

ارکان اسلامی کا رکن ہے۔ حضرت امام علی علیہ السلام نے اس پر سختی سے عمل کیا؟ کیا یہ روایات اس اہم ترین رکن کے خلاف ہیں، توضیح فرمائیں؟

جواب: پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ جناب عبداللہ بن عباس حضرت امام حسین علیہ السلام کے ساتھ کربلا تشریف کیوں نہ لے گئے تھے۔ اس کے متعلق ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ، ج ۸، ص ۳۳۵ پر لکھا ہے۔ ابن عباسؓ اس وقت نابینا تھے۔ نابینا معذور ہوتا ہے، اس لیے ان پر جہاد ساقط تھا۔ اس لیے آپ حضرت امام حسین علیہ السلام کے ساتھ کربلا نہ جاسکے تھے۔

ہمارا عقیدہ ہے جناب عبداللہ بن عباس حضرت امام حسین علیہ السلام کو دل و جان سے چاہتے تھے۔ انھوں نے آپؑ کو سفر عراق سے روکنے کی بھرپور کوشش کی تھی تو حضرت امام حسین علیہ السلام نے ان کے جواب میں فرمایا تھا:

يَابْنَ الْعَمِّ! وَاللّٰهِ اِنِّيْ لَاَعْلَمُ اَنَّكَ نَاصِحٌ مُشْفِقٌ، وَقَدْ اَزْمَعْتُ عَلَى الْمَسِيْرِ

"اے چچا کے فرزند! بخدا! میں جانتا ہوں آپ پوری محبت و شفقت کے ساتھ مجھے نصیحت فرما رہے ہیں لیکن میں عزم کر چکا ہوں"۔ (مقتل الحسین المقرم، ص ۱۶۹ بحوالہ کامل ابن اثیر، ج ۴، ص ۱۶)

آپ کے دوسرے سوال کا جواب یہ ہے: حضرت محمد حنفیہ نے امام حسین علیہ السلام کے ساتھ یزید کے خلاف خروج کیوں نہ کیا تھا؟ اس میں مختلف اقوال ہیں اور وہ یہ ہیں:

(۱) ایک روایت میں آیا ہے، اس روایت کے راوی ابوالعباس المبرد ہیں۔ جنگ جمل کے دوران جناب امیرالمومنین علیہ السلام کے پاس ایک زرہ لائی گئی۔ جناب امیر علیہ السلام نے جناب محمد حنفیہ کو بلایا اور آپؑ نے زرہ پر نشان لگایا کہ یہاں سے اُسے

کاٹ دو تو محمد حنفیہ نے اس زرہ کو اپنے دونوں ہاتھوں میں اکٹھا کیا اور مطلوبہ جگہ سے کاٹ ڈالا تھا، جس کی وجہ سے آپ کے ہاتھوں میں نقص پیدا ہو گیا تھا جس کی وجہ سے آپ کے ہاتھوں نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔

بعض روایات میں ہے کہ آپ کے ہاتھ پر آبلہ نکلا، جس کی وجہ سے آپ کا ہاتھ بے کار ہو گیا تھا۔

ایک اور روایت کے مطابق حضرت امام حسین علیہ السلام کی روانگی کے وقت آپ مریض تھے۔ روایات میں یہ بھی ملتا ہے کہ حضرت امام حسین علیہ السلام نے آپ کو مدینہ میں رہنے کی تلقین فرمائی تھی کہ ان کی مدینہ میں عدم موجودگی میں ان کی نیابت کریں اور حالات پر نگاہ رکھیں۔ آپؑ نے فرمایا:

وَاَمَّا اَنْتَ فَلَا عَلَیْکَ اَنْ تُقِیْمَ بِالْمَدِیْنَۃِ، فَتَکُوْنُ لِی عَیْنًا عَلَیْھِمْ، لَا تَخْفٰی عَنِّی شَیْئًا مِنْ اُمُوْرِھِمْ

"آپ مدینہ میں رہ جائیں اور میری طرف سے ان لوگوں پر نگرانی کریں یعنی حالات کو اپنی نگاہ میں رکھیں"۔

(۳) اب آپ کا یہ سوال کہ عبداللہ بن جعفر کربلا کیوں نہیں گئے اور واقعۂ کربلا کے بعد ان کا کردار کیا تھا۔ اس سوال کے جواب میں ہم یہ کہیں گے: انھوں نے حضرت امام حسین علیہ السلام کی طرف خط لکھا تھا۔ اس خط کے ساتھ اپنے بیٹوں عونؑ و محمدؑ کو بھیجا تھا اور عراق جانے سے منع کیا تھا۔ پھر آپ نے حاکم مدینہ عمرو بن سعید سے آپ کے لیے امان نامہ بھی لیا تھا۔ آپ کے ساتھ راستہ میں ملاقات بھی کی تھی اور واپس مدینہ کی درخواست بھی کی تھی لیکن امام حسین علیہ السلام نے انکار کر دیا تھا۔ (تاریخ الامم والملوک، ج ۴، ص ۲۹۱۔ قاموس الرجال، ج ۵، ص ۴۱۳ و الکامل فی التاریخ ابن اثیر

جب آپ کو اپنے دونوں بیٹوں کی اور حضرت امام حسین علیہ السلام کی شہادت کی

خبر ملی تو آپ کے ایک غلام نے کہا تھا: یہ سب مصائب ہمیں حضرت امام حسین علیہ السلام کی وجہ سے ملے ہیں تو جناب عبداللہ بن جعفر نے اپنا جوتا اس کے سر پر دے مارا تھا اور فرمایا تھا:

تمھیں یہ جرأت کہ حضرت امام حسین علیہ السلام کے بارے یہ کہو۔ اللہ کی قسم! میں آپؑ کے ساتھ ہوتا تو آپؑ سے کبھی جدا نہ ہوتا، یہاں تک کہ آپؑ کے قدموں میں قتل ہونا پسند کرتا۔ بخدا! ان دونوں کے مصائب مجھ پر آسان ہو گئے۔ وہ دونوں میرے بھائی اور میرے چچا کے بیٹے کی نصرت میں منزل شہادت پر پہنچ گئے ہیں۔ پھر آپ اپنی جگہ پر آئے اور کہا: الحمدللہ!

نہج البلاغہ اور شکوک وشبہات

سوال ایک محقق کی کتاب جو یونیورسٹیوں میں پڑھائی جارہی ہے اس کتاب میں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام کی طرف کتاب نہج البلاغہ جو منسوب کی جاتی ہے یہ کتاب شکوک وشبہات سے خالی نہیں ہے۔ وہ شکوک وشبہات درج ذیل ہیں:

① نہج البلاغہ میں خطبات کی کثرت اور ان کی طولانیت جیسا کہ ”خطبہ اشباح اور قاصعہ“ ہے۔ یہ کثرت اور تطویل حفظ وضبط سے مانع ہے کیونکہ وہ زمانہ کتب کی تدوین کا زمانہ نہ تھا صرف حفظ وضبط کا زمانہ تھا تو پھر ایسے زمانے میں حفظ وضبط محال ہے۔ جس زمانے میں تدوین نہیں تھی حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خطبات جن کے اہتمام میں نہایت ہی شدت سے کام لیا گیا وہ نہ تو سالم ہیں اور نہ کامل۔

② نہج البلاغہ میں جو کلام حضرت امام علی علیہ السلام کی طرف منسوب

کیا گیا ہے سند سے خالی ہے۔

③ نہج البلاغہ کے اندر جو اقوال اور خطبات ہیں وہ قابلِ وثوق مصادر میں موجود ہیں، اور وہ امام علی علیہ السلام کے غیر سے منسوب ہیں۔ صاحب نہج نے انھیں امام علی علیہ السلام کی طرف منسوب کر دیا۔

④ یہ کتاب ان اقوال پر مشتمل ہے، جو بہت سے "بزرگواروں" کے متعلق ہیں، جو ان کے شایانِ شان نہیں۔ مثال کے طور پر ہم خطبہ شقشقیہ کو لیتے ہیں۔ اس خطبہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت امام علی علیہ السلام خلافت کو بہت زیادہ چاہتے تھے حالانکہ وہ زُہد میں شہرت رکھتے تھے۔

⑤ اس کتاب کے اندر غیب کی خبریں ہیں جیسے حجاج کا معاملہ، زنگیوں کا فتنہ، تاتاریوں کی غارت گری۔ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان امور کا علم نہ تھا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی محکم کتاب کے اندر فرمایا ہے:

قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّ لَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ وَ مَا مَسَّنِيَ السُّوْٓءُ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّ بَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (اعراف:۱۸۸)

"کہہ دیجیے میں خود بھی اپنے نفع ونقصان کا مالک نہیں ہوں مگر اللہ جو چاہتا ہے (وہ ہوتا ہے) اور اگر میں غیب کی خبریں جانتا ہوتا تو بہت سے فائدے حاصل کر لیتا اور مجھے کوئی تکلیف بھی نہ پہنچتی"۔

مسجع مقفیٰ کلام چند ایک ادیبوں کے حصے میں آیا ہے۔ نہج

البلاغہ میں یہ فن کثرت کے ساتھ موجود ہے، یہ سب کچھ تکلف اور جعل ہے۔ کیونکہ حضرت امام علی علیہ السلام کے زمانے میں ایسا کلام دُور دُور تک نظر نہیں آتا۔ علاوہ ازیں ایسی مسجع عبارتیں ایک روحانی انسان سے میل نہیں کھاتیں۔

⑦ نہج البلاغہ کے اندر جو ادبی صفت نظر آتی ہے یہ عباسی دور سے تعلق رکھتی ہے، جیسا کہ یہی صفت طاؤس، چمگادڑ، شہد کی مکھی، چیونٹی، زراعت اور بادل میں موجود ہے۔

⑧ فلسفی اصطلاحات، علمِ کلام کے مقامات یہ اصطلاحیں اس دور کے مسلمانوں میں متعارف نہ تھیں۔ یہ تیسری صدی ہجری میں اس وقت متعارف ہوئیں جب یونانی، فارسی اور ہندی کتب کا عربی میں ترجمہ ہوا تھا۔ (ادب اسلامی، ڈاکٹر فائف)

آخر میں یہ عرض ہے کہ میرے سوال کا موضوع اہمیت کا حامل ہے جس کا تعلق ہمارے مذہب کے ساتھ ہے۔ ان اشکالات کے رد پر آج تک مجھے کوئی کتاب نظر نہیں آئی اور وہ کتب جو ان اشکالات پر مبنی ہیں وہ مدارس و جامعات میں پڑھائی جارہی ہیں۔ ان کا رد ضروری ہے۔

اس لیے مجھے آپ کی ذات سے اُمید ہے کہ صرف آپ ہی ان اشکالات کو رد کر سکتے ہیں۔ اس میں ہر خاص وعام کا بھلا ہے اور بالخصوص طلبا کا جو جامعات میں ہیں کیونکہ ان کے اذہان کو خراب کیا جارہا ہے، کیا اس کا علاج ودفاع ہے؟

آپ نے اپنے اُوپر مذہب حقہ کا دفاع واجب کر رکھا ہے اس

لیے آپ کو زحمت دی ہے اور ہمیں یہ بھی معلوم ہے ان اشکالات کو آپ ہی رد کر سکتے ہیں؟

جواب میں آپ کو حق اور دین اسلام کے دفاع پر سلام کہتا ہوں۔ یہ بات آپ کے ذہن میں آئی کہ وہ کتاب جو جامعات میں پڑھائی جارہی ہیں جس میں نہج البلاغہ کے خلاف خرافات جمع کیے گئے ہیں اور ان اشکالات کا جواب میں دے سکتا ہوں۔ شکریہ

آپ کی اس اطلاع پر مجھے بہت زیادہ افسوس ہو رہا ہے کہ یہ قوم حق وحقیقت کے متلاشی نہیں ہیں۔ یہ لوگ اس راہ کے راہی ہیں، جو ان کے لیے وضع کر دیا گیا ہے۔ یہ لوگ کینہ وبغض سے کام لینے والے ہیں، ان کا ہدف صرف اور صرف حق و حقیقت کو ضائع کرنا ہے اور باطل کو سازشوں کی طاقت سے پروان چڑھانا ہے اور علم و معرفت کا خاتمہ کرنا ہے۔

ان لوگوں کے علاوہ اور کون ہوسکتا ہے جو ان شکوک وشبہات کو کتابی شکل دے اور پھر وہ کتاب جامعات میں پڑھائی جائے حالانکہ ہمارے علمائے کرام نے بارہا اس امر کو اپنے تبحر علمی سے ثابت کیا ہے اور ان لوگوں کے اشکالات کو بُری طرح رد کیا ہے جس کے بعد کسی معتذر کا عذر باقی نہیں رہا اور نہ کسی حیلہ گر کا حیلہ باقی رہا۔

اس کی کیا وجہ ہے کہ ہم ان لوگوں کو نہیں پاتے جو ان اشکالات کو ظاہر کریں جن کا دفاع کسی کے بس کی بات ہی نہیں۔ جیسا کہ انجیل اور بخاری میں ہیں اور ان کے علاوہ ان کی صحیح اور مقدس کتب میں موجود ہیں، جن کی تقدیس ان کے اپنے مذہب میں اس سے زیادہ ہے جتنا کہ نہج البلاغہ کی اہلِ تشیع کے نزدیک ہے۔

جن اشکالات کا وہ تذکرہ کرتے ہیں شاید وہ سمجھتے ہیں کہ بس ہم نے ان اشکالات کے ذریعے نہج البلاغہ کا رد پیش کر دیا ہے۔ یہ صرف ان کا خواب ہے، اس

کے علاوہ کچھ نہیں۔ جس کو قرآن نے اپنے مقدس الفاظ میں یوں بیان کیا ہے:

كَسَرَابٍ بِقِيعَةٍ يَحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً ۖ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْئًا وَّوَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ ۗ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝ اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِيْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَّغْشٰىهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ۗ ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ۗ اِذَآ اَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰىهَا ۗ وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ ۝ (النور: ۳۹-۴۰)

"اور جو لوگ کافر ہو گئے ہیں ان کے اعمال ایسے ہیں جیسے ایک چٹیل میدان میں سراب، جسے پیاسا پانی خیال کرتا ہے مگر جب وہاں پہنچتا ہے تو اُسے کچھ نہیں پاتا بلکہ اللہ کو اپنے پاس پاتا ہے اور اللہ بہت جلد حساب کرنے والا ہے۔ یا ان کی مثال اس تاریکی کی طرح ہے، جو گہرے سمندر میں ہو، جس پر ایک موج چھائی ہوئی ہو۔ اس پر ایک اور موج ہو اور اُس کے اُوپر بادل تہ بہ تہ اندھیرے ہی اندھیرے ہوں۔ جب انسان اپنا ہاتھ نکالے تو وہ اُسے نظر نہ آئے اور جسے اللہ نور نہ دے تو اس کے لیے کوئی نور نہیں"۔

آپ کے استفادہ کے لیے اور دشمن کے شبہات اور اس کے مکروفریب کو رد کرنے کے لیے اپنے علمائے کرام کی بحثوں کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔ ہم آپ کے سوال کا درج ذیل ترتیب کے ساتھ جواب دیں گے:

① کیا نہج البلاغہ قابلِ وثوق اسناد سے خالی ہے؟ تو اس کے جواب میں ہم یہ کہیں گے:

أ- ہر خاص و عام خوب جانتا ہے حضرت علامہ شریف رضی رحمۃ اللہ ایک عالم جلیل، صاحب تقویٰ انسان تھے۔ وہ عزت و عظمت اور اجلال و احترام کے لحاظ سے اپنی مثال آپ تھے۔ صدق و امانت میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ ان کے بارے میں یہ کہنا کہ انھوں نے نہج البلاغہ کو وضع کیا ہے اور اُسے جناب امیر المومنینؑ کی طرف منسوب کر دیا۔ یہ ان کی ذات والا صفات پر تہمت اور بہتان ہے۔

ب- لاتعداد تالیفات موجود ہیں جن کو ان مصادر سے وضع کیا گیا ہے جن مصادر سے شریف رضی نے نہج البلاغہ کو مرتب کیا۔

نہج البلاغہ کا مصدر جو چار جلدوں پر مشتمل ہے جس کے مؤلف علامہ سید عبدالزہرا خطیب ہیں۔ انھوں نے نہج البلاغہ کے متون پر بحث فرماتے ہوئے لکھا ہے کہ نہج البلاغہ کے متون ثقہ ہیں۔ مؤلف محترم کی اس کوشش پر اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں اور اللہ سے ان کے لیے انعامات کی دعا کرتے ہیں۔

۲ آپ کے سوال کی دوسری شق کہ نہج البلاغہ کے خطبات طولانی ہیں جن کا حفظ کرنا اور ضبط کرنا بہت مشکل ہے۔ اس طویل پن سے اشکال وارد ہوتا ہے کہ یہ جناب امیر علیہ السلام کا کلام نہیں؟

أ- جی ہاں! یہ خطبات سورۂ بقرہ، سورۂ آل عمران، سورۂ نساء اور سورۂ اعراف سے زیادہ طولانی نہیں، جن کے طولانی پن کو ہر ایک جانتا ہے۔ کیا یہ لمبی سورتیں حفظ نہیں ہوئیں۔ ان کے ضبط کرنے میں کوئی مشکل پیش آئی ہے حالانکہ قرآنِ مجید کی یہ سورتیں تدوین کے زمانے سے قبل نازل ہوئیں۔

ب- حضرت امیر المومنینؑ کے خطبات کی کتابت ان کے زمانے میں ہوتی رہی۔ تاریخ نے ان لوگوں کے اسماء کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لیا ہے۔ ان میں سے کچھ اسماء یہ ہیں:

● زید بن وہب جہنی: اس صاحب نے آپؑ کے خطبات کو جمع کیا۔ (اتقان المقال، ص ۱۹۲)

● جناب حارث اعور ہمدانی: اس صاحب نے امام علی علیہ السلام کے کچھ خطبات کو اس وقت تحریر کیا تھا، جب آپؑ خطبہ دے رہے ہوتے تھے۔ (سفینۃ البحار، ج ۱، ص ۳۹۲)

اس طرح اصبغ بن نباتہ ہیں۔ انھوں نے بھی آپؑ کے خطبات کو لکھا تھا۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے علما ہیں، جنھوں نے آپؑ کے خطبات کو لکھا اور جمع کیا۔

۳ آپ کے سوال کی تیسری شق کہ بہت سے خطبات و اقوال جو دوسرے لوگوں سے صادر ہوئے پھر ان کی نسبت امام علی علیہ السلام کی طرف دے دی گئی۔ اس حوالے سے ہمارا جواب یہ ہے:

ا۔ جناب شریف رضی ایک جلیل القدر عالم تھے۔ ان کی وثاقت سے ہر خاص و عام باخبر ہے۔ وہ اپنے دور کے ثقہ تھے۔ ان کے مقابل میں اس مقام کا ثقہ نہ تھا جس مقام کے آپ مالک تھے۔ ان کے اس عظیم الشان کارنامے میں یا ان کے باقی امور میں کسی قسم کے شکوک وشبہات کا سوال بھی پیدا نہیں ہوتا۔

ب۔ وہ کتب جن میں نہج البلاغہ کے متون جمع ہیں ان میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ یہ سب نصوص جن کا ذکر مؤلفین نے کیا ہے، ثابت ہیں اور ان کے راویان ثقہ ہیں۔ یہ تمام لوگ شریف رضی کے عصر کے نہیں تھے بلکہ اس زمانے سے تعلق رکھتے تھے جس زمانے میں ابھی شریف رضی داخل ہی نہیں ہوئے تھے۔ ان سب نے لکھا ہے کہ یہ جناب امیر المومنین امام علی علیہ السلام کا کلام ہے۔

ج۔ بڑے بڑے عظیم الشان خطبائے اسلام نے اپنی خطابت اور بلاغت کو نہج البلاغہ کے خطبات سے توانا بنایا۔ انھوں نے حضرت امام علی علیہ السلام کے خطبات کو حفظ کیا تو اُمت مسلمہ کے خطیب بن گئے۔

محمد بن عبدالمالک زاہد قارقی کو لوگوں میں اپنے وعظ و نصیحت اور خطابت کے لحاظ سے مقام و مرتبہ حاصل تھا۔ وہ حافظ نہج البلاغہ تھے۔ وہ نہج البلاغہ کی عبارتوں کو تبدیل بھی کرتا تھا۔ لوگ سمجھتے تھے کہ یہ اس کا اپنا کلام ہے۔ (الوافی بالوفیات، ج ۴، ص ۴۴)

ابن نباتہ نے کہا: میں نے خطابت کا ایک بے پناہ خزانہ حفظ کر رکھا تھا جو انفاق سے ہمیشہ بڑھتا تھا۔ اس میں وسعت و کثرت پیدا ہوتی تھی۔ میں نے نہج البلاغہ کی ایک سو فصلیں یاد کر رکھی ہیں۔ (امراء البیان، ج......ص ۱۵۰)

معاویہ نے جناب امیر المومنین علی علیہ السلام کے بارے میں کہا تھا:

وَهَلْ مَنَّ الْفَصَاحَةَ لِقُرَيْشٍ غَيْرُهٗ

"قریش کے لیے فصاحت کی گرہ اس کے علاوہ کسی اور نے نہیں کھولی"۔ (شرح نہج البلاغہ معتزلی، ج ۱، ص ۸، امراۃ البیان، ج ۱، ص ۴۵)

اس کے علاوہ کتنے لوگ ہیں جنھوں نے حضرت امام علی علیہ السلام کے خطبات کو حفظ کیا اور اپنی توانا خطابت کے لحاظ سے زمانے پر چھائے رہے۔ یہ تمام علمائے کبار امیر المومنین حضرت امام علی علیہ السلام کی ذات والاصفات سے متاثر تھے۔ انھوں نے آپ کے خطبات کو حفظ کیا ہوا تھا۔ اپنی ضرورت کے مطابق ان خطبات کا اقتباس پیش کرتے تھے اور زمانے میں فصاحت میں اپنی مثال آپ بن گئے تھے۔ ہمیں اس سے غرض نہیں ہے کہ وہ اس سے شہرت کسب کرنا چاہتے تھے یا تقیہ اور خوف یا اس کے علاوہ کچھ اور!

اب آپ فیصلہ کریں کہ نہج البلاغہ غیر کا کلام ہے یا امام علی علیہ السلام کا کلام ہے۔

اس بحث سے ان تمام اشتباہات کا قلع قمع ہو گیا کہ یہ کلام کسی اور کا تھا اور اس کی نسبت حضرت امام علی علیہ السلام کی طرف دی گئی۔ نہج البلاغہ بلا ریب امام علی علیہ السلام کا

کلام ہے۔(شرح نہج البلاغہ معتزلی، ج......، ص ۹۹)

د۔ کسی ''اباضی'' عالم نے ذکر کیا۔ اس فرقہ اباضیہ کے علما ر ستمی دور حکومت میں رہتے تھے۔ انھوں نے اپنے منبروں پر خطاب کے دوران کہا: نہج البلاغہ حضرت امام علی علیہ السلام کا کلام ہے۔(مشاکلۃ الناس لزمانھم، ص ۱۵)

لیکن حقیقت یہ ہے کہ حضرت امام علی علیہ السلام کے بہت سے اقوال کی نسبت بعض لوگوں کی طرف دے دی گئی ہے حالانکہ کلام جناب امیر علیہ السلام کا ہے اور نسبت ان کے غیر کی طرف کردی گئی کہ انھوں نے ایسا فرمایا۔ کیونکہ کثرت حقیقت کو جانتی ہی نہیں اور لوگ جو جاہل ہوتے ہیں وہ ظاہر پر عمل کرتے ہیں۔

ذ۔ یہ موارد جن کا دعویٰ کیا گیا ہے، کسی قسم کی التفات کے قابل نہیں۔ جی ہاں! اگر ہم مفروضہ قائم کریں تو یہ ایسا مفروضہ ہوگا جو محال ہے۔ جس کو کسی صورت میں ثابت نہیں کیا جاسکتا کہ کلام کسی اور کا ہو اور نسبت امامؑ کی طرف ہو۔ ہر لحاظ سے غلط ہے۔

۳ ان کا کہنا کہ نہج البلاغہ میں کچھ ایسی باتیں ہیں جن سے بعض بزرگواروں کی نفی ہوتی ہے جیسا کہ خطبہ شقشقیہ ہے۔ جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپؑ خلافت کو بہت چاہتے تھے حالانکہ حضرت امام علی علیہ السلام تو زہد میں بہت زیادہ شہرت رکھتے تھے۔ تو اس سوال کے جواب میں ہم یہ درج ذیل نکات پیش کریں گے:

ا۔ نہج البلاغہ کے اندر اگر کہیں کوئی طعن موجود ہے تو وہ طعن نہیں بلکہ مظلوم کا شکوہ ہے اور اعلان ہے کہ اس کا حق غصب کیا گیا ہے اور آپؑ نے اس صورت حال کو بیان فرمایا جو آپؑ کے ساتھ پیش آیا تھا۔ آپؑ نے خوب تنقید کی تھی لیکن صدق و صواب کے بندھن کے ساتھ جو کچھ فرمایا، دلیل کے ساتھ فرمایا۔

ب۔ اس دور میں حکومت نے آپؑ کے ساتھ جو کچھ کیا، آپؑ کے لیے ایک بہت بڑی مصیبت تھی۔ آپؑ کے گھر پر ہجوم کیا گیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیٹی کی

حرمت کی ہتک کی گئی، ان پر ضربات لگائی گئیں، ان کا بیٹا سقط کیا گیا۔ پھر ان کا حق فدک غصب کیا گیا۔ امامؑ کو بیعت پر مجبور کیا گیا اور ان کا حق ان سے چھینا گیا۔ اتنے بڑے مصائب سے آپؑ دوچار کیے گئے، جن کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔

ج- جو کچھ خلفاء نے صحابہ کے حق میں کیا اور جو کچھ صحابہ نے صحابہ کے لیے کیا ممکن ہی نہیں ہے کہ ہم اسی کو جناب امیر علیہ السلام کے لیے قیاس کریں کہ جو کچھ آپؑ کے ساتھ کیا گیا ان سب کے حالات موجود ہیں۔

د- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اعلانیہ طور پر فرمایا تھا: "عنقریب وہ وقت آنے والا ہے جب قیامت کا دن برپا ہوگا تو میرے اکثر صحابہ کو جہنم کی طرف لے جایا جا رہا ہوگا یہاں تک کہ صرف اتنے بچ جائیں گے، جتنے بغیر چرواہے کے اونٹ ہوتے ہیں تو اس وقت میں اصحابی، اصحابی کی آواز بلند کروں گا تو اس وقت کہا جائے گا، آپؐ نہیں جانتے انھوں نے آپؐ کے بعد کیسے کیسے کام کیے۔ یہ سب واپس اپنے پہلے دین پر چلے گئے تھے۔ پس میں کہوں گا: بربادی ہے، بربادی ہے، اس کے لیے، جس نے میرے بعد میرے دین کو بدلا۔

میں نے ان تمام روایات کو اپنی کتاب "دراسات و بحوث فی التاریخ والاسلام" میں عدالت صحابہ فی الکتاب والسنۃ کے عنوان کے تحت جمع کیا ہے۔ رجوع فرمائیں۔

قرآن کریم میں صحابہ کے تمام احوال موجود ہیں۔ ان لوگوں کے حالات جنھوں نے جنگ تبوک سے اعراض کیا تھا جو تعداد میں تقریباً پچاسی اٹھاسی تھے۔ کچھ وہ تھے، جنھوں نے نافرمانیاں کیں، کچھ وہ تھے، جنھوں نے فتنے کھڑے کیے۔ انھی میں سے وہ بھی تھے، جنھوں نے صدقات کی تقسیم میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر الزام دھرے۔ کچھ وہ تھے، جنھوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اذیتیں دیں۔ اللہ تعالیٰ نے انھی کے بارے میں فرمایا، جن کے دلوں میں مرض تھا کہ یہ وہ ہیں جن کے دلوں میں مرض

تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے مرض میں اضافہ فرمایا۔ وہ بھی تو انھی لوگوں کا ایک فرد تھا جو ایک تہائی لشکر سمیت میدانِ جنگ سے لوٹ آیا تھا، جس کا نام ابن اُبی تھا۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں پہلی حالت کی طرف لوٹا دیا۔

۵ حضرت امام علی علیہ السلام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ان اصحاب کی تعریف فرمائی، جو متقی و پرہیزگار تھے۔ آپؑ نے ان لوگوں کی تعریف کی، جو دین خداوندی پر قائم رہے اور دین میں بدعات کے دھندے سے اپنے آپ کو محفوظ رکھا۔ آپؑ نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے انھی اصحاب کے بارے میں ہمیں وصیت فرمائی اور ایسے لوگوں پر لعنت فرمائی جنھوں نے دین میں بدعات کیں۔ (مستدرک الوسائل، ج۳، ص۳۳۳)

۶ حضرت امام علی علیہ السلام نے جب بات اپنے حقوق کی فرمائی تو کیا حق کا بیان کرنا جرم ہے؟ کیا اپنے حقوق کی بات نہیں کی جاسکتی؟ بلکہ وہ اپنے حق کے معاملے میں تمام لوگوں پر اولویت رکھتے تھے اور اُمت مسلمہ کو آگاہی دینا چاہتے تھے کیونکہ اس امر کی ضرورت تھی کیونکہ ان کے حقوق سلب ہوئے تھے، اس لیے آپؑ نے اپنے حقوق کی بات کی۔ حقوق کی بات کرنا آپ کا حق تھا۔

۷ جب کسی امر میں اشتباہ پیدا ہو جائے اور ایک مسلم کو پتہ نہ چلے کہ یہ حق ہے یا حق نہیں ہے تو اس اسٹیج پر حضرت امام علی علیہ السلام کی زندگی اور ان کے کردار کی طرف نگاہ کی جائے گی کیونکہ ان کی شخصیت کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا:

عَلِیٌّ مَعَ الْحَقِّ وَالْحَقُّ مَعَ عَلِیٍّ یَدُوْرُ مَعَهٗ کَیْفَمَا دَارَ

''علیؑ حق کے ساتھ ہے اور حق علیؑ کے ساتھ ہے، جدھر علیؑ چلتے ہیں حق ان کے ساتھ چلتا ہے''۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آپؑ کے بارے میں یہ بھی فرمایا:

عَلِیٌّ مَعَ الْقُرآنِ وَالْقُرآنُ مَعَ عَلِیٍّ
"علیؑ قرآن کے ساتھ ہے اور قرآن علیؑ کے ساتھ ہے"۔

ان احادیث کا مطلب یہ ہے کہ ہم پر واجب ہے کہ ہم حضرت امام علی علیہ السلام پر اپنی نظریں جما کر رکھیں۔ آپ کیا بجالاتے ہیں اور کیا نہیں بجالاتے، جو بجالاتے ہیں وہ حق ہے اور جو سرانجام نہیں دیتے وہ باطل ہے۔ ہمارے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ ہم اپنی طرف سے ہیر پھیر کرتے رہیں اور اس کو دین خداوندی خیال کریں۔

۸ اب رہا سوال کہ حضرت امام علی علیہ السلام نے خلفا کے بارے وہ گفتگو کیوں کی، جو نہیں کرنا چاہیے تھی۔ اس کا جواب یہ ہے: حضرت امام علی علیہ السلام نے ہمیشہ ان کے وقار واحترام کا خیال رکھا۔ اُس وقت تک جس وقت تک وہ حق کے ساتھ رہے۔ جب انھوں نے حق کو چھوڑا تو آپؑ نے اپنے موقف کی پاسداری کی اور جب آپؑ کے پاس اختیار آیا تو آپؑ نے فرمایا:

الذلیل عندی عزیز حتی اخذ الحق له والقوی عندی ضعیف حتی اخذ الحق منه (نہج البلاغہ، خطبہ ۳۷)

"ایک آدمی جو معاشرے میں ذلیل سمجھا جاتا ہے، وہ میرے نزدیک اُس وقت عزیز ہے، جب تک میں اس کا حق اُسے نہ دلواؤں اور میرے نزدیک ایک طاقتور انسان کی کوئی حیثیت نہیں، جب تک اُس سے دوسروں کے حقوق چھین نہ لوں"۔

حفاظت اسلام کا پروگرام اور ہے، ان کی توقیر ایک دوسرا امر ہے۔ امام علیہ السلام نے امراؤں کی تصریح فرمادی کہ ان کی زندگی کا مقصد حفاظتِ اسلام ہے۔ آپؑ نے نہج البلاغہ میں مختلف مقامات پر اس امر کی وضاحت فرمائی۔

۹ اب رہی بات خطبہ شقشقیہ کی، یہ خطبہ تو ہمیشہ سے انھیں چبھتا آرہا ہے اور

اسی پر واویلا کرتے آ رہے ہیں اور اسی پر اپنے اشکالات کے تیر برساتے آ رہے ہیں۔ کبھی تو انھوں نے کہا کہ یہ خطبہ اشتبہات پر مبنی ہے اور کبھی کہا یہ خطبہ اپنے دامن میں بہت سے پردہ نشینوں کے لیے توہین کے پہلو رکھتا ہے۔ لیکن اگر کوئی صاحب انصاف تاریخ کے جھروکوں میں ایک ادنیٰ سی نگاہ کرے تو اُسے صاف واضح نظر آ جاتا ہے، جو کچھ اس خطبہ کے اندر ہے وہی ہے جو کچھ زمانہ قریب میں ہوا تھا۔ آپؑ نے اسی خطبہ میں ان تاریخی حقائق کی ترجمانی فرمائی۔ یہ خطبہ صرف شیعیانِ حیدر کی روایات سے ثابت نہیں بلکہ اسی خطبہ کو اہلسنت کے محدثین نے اپنی کتب میں نقل کیا ہے۔ ان حقائق کی روشنی میں ان اشکالات وشبہات کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ اس خطبہ کے تمام مضامین ان تاریخی حقائق پر مشتمل ہیں، جن سے انکار کی گنجائش ہی نہیں۔

⑩ مجھے آج تک اس امر کی سمجھ نہیں آئی کہ اسی خطبہ سے مخالفین نے حب دنیا کو کیسے جوڑا ہے۔ ایسا کہنے والوں کو آپؑ کا زُہد کیوں نظر نہیں آیا؟ اس کے علاوہ حق پر ظلم وتعدی کرنے والوں کے خلاف کیوں خاموشی رہی؟ امام علی علیہ السلام کی شخصیت اپنے تمام اوصاف کے اعتبار سے معروف شخصیت تھی۔ آپ زُہد وعبادت میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔ آپؑ کو دنیا سے کوئی غرض نہ تھی علاوہ ازیں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد علم میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے جس کے سامنے کسی کو دم مارنے کی جرأت نہ تھی۔ وہ علم کی دولت ہی تھی جس نے آپؑ کا دفاع کیا اور آپؑ کا یہی علم جس نے آپؑ کی شہادت کے بعد آپؑ کے بیٹوں اور آپ کے شیعوں کا دفاع کیا کیونکہ آپؑ کے اور آپؑ کے اہلِ بیتؑ اور آپؑ کے شیعوں کے مخالفین کے پاس حکومت ودولت تھی اور وہ اپنی طاقت کے تمام وسائل امام علی علیہ السلام اور ان کے طرفداروں کے خلاف استعمال کر رہے تھے۔

مخالفین کس بنیاد پر کہتے ہیں کہ خطبہ شقشقیہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ حضرت امام علی علیہ السلام خلافت وحکومت پر حریص تھے؟ حالانکہ ان کی یہ دلیل بے بنیاد ہے۔ آپؑ

نے تو اس خطبہ میں اللہ کے اوامر بتائے ہیں اور آپؑ نے لوگوں کو یہ بتایا کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد کے حکمرانوں نے حرمات الٰہیہ کی ہتک کی اور ہلاکتوں کا ارتکاب کیا۔ آپؑ نے ان حقائق سے پردہ اُٹھایا، جن پر پردے ڈال دیئے گئے تھے۔

(۱۱) یہ امر تو نہایت ہی واضح ہے کہ حضرت امام علی علیہ السلام نے یہ خطبہ اس زمانے میں دیا، جس زمانے میں آپؑ کے پاس حکومت تھی۔ جب آپؑ کے پاس حکومت تھی تو آپؑ کے مخالف کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ آپؑ خلافت پر حریص تھے حالانکہ حکومت آپؑ کے پاس موجود تھی، حالانکہ آپؑ نے اپنے اس خطبہ میں ان واقعات کو بیان کیا، جو رسول اللہ ﷺ کے بعد پیش آئے تھے اور جن پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی گئی تھی۔ آپؑ نے اپنے اس خطبہ سے حقیقتوں کو بے نقاب کر دیا کیونکہ ان حقائق کا تعلق عقیدے کے ساتھ تھا۔ اس لیے ضروری تھا کہ لوگوں کو حقائق سے آگاہ کر دیا جائے۔ اگر ان حقائق کو بیان نہ کیا جاتا تو متلاشیانِ حق کو حق سے آگاہی نہ ہوتی۔ جب حق سے آگاہی نہ ہوتی تو دنیا اور آخرت کا نظام تباہ ہو کر رہ جاتا کیونکہ امامت کا مسئلہ ایک اہم ترین مسئلہ تھا اور رسول اللہ ﷺ کے بعد مسلمانوں کو اس مسئلہ کی طرف متوجہ کرنا ضروری تھا۔ رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات اور فرامین خداوندی سے آگاہی ضروری تھی کیونکہ رسول اللہ ﷺ کے وصال کے بعد جو کچھ ہوا وہ سب کے سامنے ہے۔ اس لیے حضرت امام علی علیہ السلام نے اپنے دورِ حکومت میں واجبات الٰہی کی ترویج کے لیے قیام فرمایا اور ان کو امامت کے عقیدہ کو مضبوط کرنے کی تلقین فرمائی۔

(۱۲) خطبہ شقشقیہ کو صرف سید شریف رضی نے روایت نہیں کیا بلکہ ان سے قبل بہت سے راویوں نے اپنی اپنی تالیفات میں روایت کیا ہے۔ ابن قبہ رازی نے اپنی کتاب الانصاف فی الامامۃ میں روایت کیا۔ ان کے علاوہ البلخی الکعبی نے روایت کیا ہے۔ اس طرح ابو احمد عسکری نے بھی روایت کیا ہے۔ شیخ صدوق نے معانی اخبار میں

اور علل الشرائع میں روایت کیا۔ ابن ربہ المالکی نے عقد فرید میں نقل کیا۔

ابوعلی جبائی اور مفید جو سید رضی کے ہم عصر تھے، انھوں نے بھی اس خطبہ کو اپنی کتب میں نقل کیا۔ اہل سنت کے بہت سے علما نے اس خطبہ کو نقل کیا۔ مزید تحقیق کے لیے نہج البلاغہ کے مصادر کا مطالعہ فرمائیں۔

جب ایک امر پہلے سے موجود ہو تو اگر بعد میں آنے والا اُسے اپنی کتاب میں بیان کر دے تو اس پر کس صورت اشکالات وارد کیے جاسکتے ہیں۔ سید رضی سے قبل علمائے اسلام نے حضرت امام علی علیہ السلام کے خطبات کو اپنی اپنی کتب میں نقل کر دیا تھا۔ وہی مصادر اب بھی موجود ہیں۔

نہج البلاغہ اور غیب کی خبریں

سوال معترض کا اعتراض ہے کہ نہج البلاغہ میں غیب کی خبریں موجود ہیں جیسے حجاج کا معاملہ، زنگیوں کا فتنہ اس طرح تاتاریوں کی غارت گری ان تمام امور کی طرف حضرت امام علی علیہ السلام نے اپنے خطبات میں اشارے فرمائے تھے۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم علمِ غیب نہیں جانتے تھے تو حضرت امام علی علیہ السلام کس طرح علمِ غیب جانتے تھے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے قرآن کریم میں فرمایا ہے:

قُلْ لَّاۤ اَمْلِكُ لِنَفْسِیْ نَفْعًا وَّ لَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ وَ لَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَیْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَیْرِ وَ مَا مَسَّنِیَ السُّوْٓءُ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِیْرٌ وَّ بَشِیْرٌ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ (اعراف:۱۸۸)

جواب اس سوال و اعتراض کا جواب یہ ہے۔

① پہلی بات تو یہ ہے کہ ایسی غیبی خبریں صرف نہج البلاغہ میں موجود نہیں بلکہ

اسلامی مصادر میں بھی موجود ہیں۔ آپ جس کتاب کو چاہیں اُٹھائیں یہ واقعات آپ کو مل جائیں گے۔ آپ اس کتاب کو اُٹھائیں، جس میں حضرت امام علی علیہ السلام کے ساتھ خوارج کی جنگ کا ذکر ہے۔ آپؑ نے ذوالثدیہ کے بارے میں جو کچھ فرمایا تھا وہی ہوا۔ اگر یہ روایت جھوٹی ہے تو پھر آپ جو کچھ کہنا چاہیں کہہ سکتے ہیں۔ اسی طرح صحاحِ ستہ میں وہ احادیث موجود ہیں جو امورِ غیبیہ پر مشتمل ہیں۔

۲ ہر صاحبِ علم انسان جانتا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت امام علی علیہ السلام کو اُمورِ غیبیہ پر مطلع کیا تھا اور یہ علم رسولؐ اللہ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوا تھا۔ کتب حدیث میں یہ سب کچھ موجود ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وہ احادیث جو آخری زمانے سے متعلق ہیں، اس امر پر شاہد ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس علمِ غیب تھا، جو انھیں اللہ کی طرف سے ملا تھا۔ اس طرح ہمارے پاس کثرت کے ساتھ دلائل موجود ہیں کہ تمام انبیائے علیہم السلام کے پاس علمِ غیب تھا۔

خداوند تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے قرآن مجید میں فرمایا: جب انھوں نے اپنی قوم سے کہا:

وَ اُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَ مَا تَدَّخِرُوْنَ فِيْ بُيُوْتِكُمْ

''اور میں تم لوگوں کو بتاتا ہوں کہ تم کیا کھاتے ہو اور اپنے گھروں میں کیا جمع کر کے رکھتے ہو''۔ (آل عمران: ۴۹)

اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عائشہ کو خبر دی جب اُس نے راز فاش کیا تھا حالانکہ آپؐ نے اُسے تاکید فرمائی تھی کہ یہ راز راز رہنا چاہیے تو قرآن مجید نے اس واقعہ کو اس انداز میں بیان فرمایا:

قَالَتْ مَنْ اَنْۢبَاَكَ هٰذَا قَالَ نَبَّاَنِيَ الْعَلِيْمُ الْخَبِيْرُ

"اُس نے کہا: آپ کو کس نے خبر دی؟ آپؐ نے فرمایا: مجھے اس ذات نے خبر دی جو علیم اور خبیر ہے"۔ (التحریم:۳)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا: وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ (الصف:۶) "اپنے بعد آنے والے رسول کی بشارت دینے دینے والا ہوں، جن کا نام احمد ہوگا"۔

اللہ تعالیٰ نے جب اپنے نبی ﷺ کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قصہ بتا دیا تو اس کے بعد فرمایا:

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ (آل عمران:۴۴)

"یہ غیب کی خبریں ہیں ہم آپؐ کو وحی کے ذریعہ بتا رہے ہیں"۔

حضرت نوح علیہ السلام کے قصہ کے بعد فرمایا:

تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ (ہود:۴۹)

"یہ ہیں غیب کی کچھ خبریں، جو ہم آپؐ کی طرف وحی کر رہے ہیں"۔

برادرانِ یوسفؑ کے قصہ کے بعد فرمایا:

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ (یوسف:۱۰۲)

"(اے رسولؐ) یہ قصہ غیب کی خبروں میں سے ہے جسے ہم تمہارے پاس وحی کے ذریعہ سے بھیجتے ہیں"

ان آیات کے بعد کیا اس بات کی گنجائش رہتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ علمِ غیب نہیں جانتے تھے؟

اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کے علمِ غیب کے بارے ایک خاص آیت نازل فرمائی:

عٰلِمُ الْغَیْبِ فَلَا یُظْهِرُ عَلٰی غَیْبِهٖۤ اَحَدًا ۝ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ (جن:۲۶-۲۷)

"وہ غیب کا جاننے والا ہے اور اپنے غیب کسی پر ظاہر نہیں کرتا سوائے اس رسولؐ کے جسے اُس نے برگزیدہ کیا ہو"۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ

"اور وہ [illegible] خدا [illegible] سے کسی چیز کا احاطہ نہیں کر سکتے مگر جس قدر وہ چاہے"۔(البقرہ:۲۵۵)

خداوند تعالیٰ نے خود اپنے انبیاءؑ کو علمِ غیب پر اطلاع دی کیونکہ علمِ غیب کا جاننا ان کی نبوت کے لیے ضروری امر تھا۔

③ بشر کا علومِ غیبیہ پر مطلع ہونا فیضِ خداوندی کے ذریعے ممکن ہے۔ یہ امر ذاتی نہیں ہے بلکہ یہ اللہ تعالیٰ سے مربوط ہے۔ مبداء فیض وہی ذات ہے، باقی سب اس سے استفادہ کرنے والے ہیں۔

خداوند تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں فرمایا:

وَکَذٰلِكَ نُرِیْۤ اِبْرٰهِیْمَ مَلَکُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

"اور اس طرح ہم ابراہیمؑ کو آسمانوں اور زمین کا نظام حکومت دکھاتے تھے"۔(انعام:۷۵)

یہ جنابِ ابراہیمؑ کی رؤیت ذاتی نہیں تھی بلکہ الٰہی تھی۔ اس طرح رسول اللہؐ کی معراج یہ بھی اللہ تعالیٰ کے ارادہ کے تابع بھی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

لِنُرِیَهٗ مِنْ اٰیٰتِنَا (الاسراء:۱)

"تاکہ ہم انھیں اپنی نشانیاں دکھائیں"۔

اللہ تعالیٰ نے لوحِ محفوظ کو جناب اسرافیل کی دونوں آنکھوں کے درمیان نصب فرمایا اور رسول اللہ ﷺ نے اسی لوح کا مطالعہ فرمایا۔ اب یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ رسول اللہ ﷺ کا ذاتی علم ہے کہ آپؐ اپنی ذات کے اعتبار سے غیب پر مطلع نہیں ہیں بلکہ اس علمِ غیب کا مبداء اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ اب علمِ رسول کو عام بشر کے علم پر قیاس نہیں کیا جاسکتا کیونکہ علم کے حصول کے راستے جدا جدا ہیں۔ رسولؐ اللہ نے علم حاصل کیا وہ راستہ اور ہے اور دوسرے لوگوں نے جو علم حاصل کیا وہ راستہ اور ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ کے علمِ غیب اور انبیاءؑ کے علمِ غیب میں فرق ہے۔ وہ مبداء فیض ہے اور انبیاؑ نے علمِ غیب اُسی ذات سے حاصل کیا۔ اسی علم کو علم بالغیر کہا جاتا ہے نہ علم بالذات ذاتی علم اللہ کا ہے۔

ان آیاتِ مبارکہ کی روشنی میں یہ بات روشن ہوگئی کہ بندوں کا علمِ غیب ذاتی نہیں ہے۔ اس لیے اس مقصد کی وضاحت کے لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ

”اگر میں غیب کی باتیں جانتا ہوتا تو بہت سے فائدے حاصل کرلیتا“۔(اعراف:۱۸۸)

اس فرمان سے پتہ چلتا ہے کہ علمِ غیب بندگانِ خدا کا ذاتی علم نہیں ہے۔ یہ اور بات ہے کہ خداوند تعالیٰ اپنے برگزیدہ رسولوں کو علمِ غیب دے دیتا ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام لوگوں کو بتا دیتے تھے کہ تم نے کیا کھایا ہے اور کیا اپنے گھروں میں جمع کیا ہے۔ جنابِ عیسیٰؑ کا یہ علم ان کا ذاتی علم نہ تھا بلکہ اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ علم تھا۔

یہ بھی صحیح ہے کہ کبھی اللہ تعالیٰ ان سے علمِ غیب سلب کرلیتا تھا اور کبھی عطا کر دیتا تھا جیسا کہ فرمانِ خداوندی ہے:

اَلَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِیْٓ اَنْفُسِهِمْ (النحل:۲۸)

''فرشتے جن کی روحیں اس حالت میں قبض کرتے ہیں کہ وہ اپنے نفس پر ظلم کر رہے ہوں''۔

قرآنِ مجید کی ایک اور آیت ہے:

قُلْ یَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِیْ وُكِّلَ بِكُمْ (السجدہ:۱۱)

''کہہ دیجیے موت کا فرشتہ جو تم پر مقرر کیا گیا ہے تمہاری روحیں قبض کرتا ہے''۔

ایک اور آیت میں آیا ہے:

اَللّٰهُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِهَا (الزمر:۴۲)

''موت کے وقت اللہ روحوں کو قبض کرتا ہے''۔

ابن میثم بحرانی نے اس موضوع کی ایک اہم بات بیان کی ہے۔ آپ نے کہا: علمِ غیب سے مراد وہ علم ہے۔ علمِ غیب صرف اور صرف اللہ تعالیٰ پر صادق آتا ہے جبکہ ہر علم جو اس کے صاحب کے پاس ہوتا ہے لیکن علمِ غیب اس علم سے جدا ہے۔ علمِ غیب کی اہلیت ہر آدمی نہیں رکھتا، کچھ خاص افراد ہوتے ہیں، جن کے پاس یہ اہلیت ہوتی ہے تو ان پر اللہ کی طرف سے یہ عطا ہوتی ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

عٰلِمُ الْغَیْبِ فَلَا یُظْهِرُ عَلٰى غَیْبِهٖٓ اَحَدًا ○ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ (الجن:۲۶-۲۷)

''(وہی) غیب دان ہے اور اپنی بات کسی پر ظاہر نہیں کرتا مگر جس پیغمبر کو پسند فرمائے''۔

ابن میثم کی گفتگو یہاں ختم ہوئی۔ (شرح نہج البلاغہ، ابن میثم، ج۱، ص۸۴-۸۵)

ابن میثم نے کہا: علمِ غیب اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ خاص ہے۔ علمِ غیب پر

اگر کسی بندے کو اطلاع ہو جائے تو یہ سب کچھ اسی ذات کے فضل کا حصّہ ہے۔ وہ اطلاع کسی واسطہ کے ذریعے بھی ہو سکتی ہے اور بلاواسطہ بھی ہو سکتی ہے۔ علمِ غیب پر اطلاع ان بندگانِ خدا کو حاصل ہوتی ہے، جو اہل ہوتے ہیں۔ ان میں علمِ غیب کے حصول کی استعداد ہوتی ہے۔ ابن میثم نے جناب امیر علیہ السلام کے اس فرمان سے یہ سب کچھ استنباط کیا۔ جب کسی نے جناب امیر علیہ السلام کے حضور عرض کیا تھا: اے امیر المومنینؑ! آپ کو علمِ غیب دیا گیا ہے تو آپؑ نے اس کے جواب میں فرمایا تھا: اے کلبی بھائی! یہ علمِ غیب نہیں ہے۔ یہ وہ علم ہے جو صاحبِ علم سے حاصل ہوا ہے۔ یہ وہ علم ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو تعلیم کیا اور انھوں نے مجھے تعلیم فرمایا اور میرے حق میں دعا فرمائی کہ علم میرے سینے میں محفوظ رہے۔

اس کے علاوہ ابن میثم نے انھی فرامین سے استفادہ کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت امام علی علیہ السلام کو تعلیم کیا تو یہ تعلیمات جزئیات پر مشتمل نہ تھیں بلکہ قوانین کلیہ پر مشتمل تھیں۔ اگر یہ علمِ جزئیات پر مشتمل ہوتا تو پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعا کی ضرورت نہ ہوتی جس کا ذکر امام علی علیہ السلام نے فرمایا کیونکہ جزئیات کا سمجھنا ایک آسان کام ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا امام علی علیہ السلام کے لیے دعا فرمانا کہ ان کا قلب ان علوم کو محفوظ رکھے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپؑ ان قوانینِ علمی کے فہم کی اہلیت رکھتے تھے اور ان کی تفصیلات و کیفیات کی استعداد رکھتے تھے۔ اسی امر کی طرف آپؑ نے اشارہ فرمایا:

عَلَّمَنِیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اَلْفَ بَابٍ مِنَ الْعِلْمِ فَانْفَتَحَ لِیْ مِنْ کُلِّ بَابٍ اَلْفُ بَابٍ

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے علم کے ہزار باب سکھائے تو پھر مجھ پر ہر ہر باب سے ہزار ہزار دروازے کھل گئے"۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

أُعْطِيْتُ جَوَامِعَ الْكَلِمِ وَأُعْطِي عَلِيٌّ جَوَامِعَ الْعِلْمِ

"مجھے جوامع الکلم عطا کیے گئے اور علیؑ کو قوانینِ علم عطا کیے گئے"۔

یہ سب کچھ عطائے الٰہی سے تھا اس لیے اُعْطِيَ کا صیغہ استعمال کیا گیا۔ (شرح نہج البلاغہ ابن میثم، ج۱، ص۸۴-۸۵)

۵ اس سوال کا جواب کہ یہ غیبی اخبار جو نہج البلاغہ میں ہیں، یہ سید رضی کی اختراعات ہیں اور یہ موضوعی ہیں۔

اس سوال کے جواب میں ہم یہ عرض کریں گے کہ نہج البلاغہ کے یہ تمام خطبات اور یہ غیبی اخبارات سید رضی کے زمانے سے قبل کے مصادر میں موجود ہیں۔ اگر ایسا کہنا جائز ہو تو پھر تاتاریوں کی غارت کی خبر جو نہج البلاغہ میں ہے، اس کی نہج البلاغہ کی طرف نسبت دینا جائز نہ ہوگا حالانکہ یہ واقعہ ۶۱۶ھ میں ہوا تھا۔ یعنی سید شریف رضی کی وفات کے دو سو سال بعد اور نہج البلاغہ کا یہ نسخہ جو آج دنیا میں موجود ہے تاتاریوں کی غارت سے قبل موجود تھا۔ عراق کے عجائب گھر میں نہج البلاغہ کا جو نسخہ موجود ہے، اس کی تاریخ کتابت ۵۵۶ھ درج ہے۔

حضرت امام علی علیہ السلام کا کلام مسجع کیوں ہے؟

سوال نہج البلاغہ میں امام علیہ السلام کا کلام مسجع ہے، جو دلالت کرتا ہے کہ یہ اپنی طرف سے بنایا گیا ہے حالانکہ حضرت امام علی علیہ السلام کا دور کلام کے اس اسلوب سے تعلق رکھتا تھا جس میں قافیہ نہیں ہوتا تھا۔ نہج البلاغہ کا اکثر کلام مسجع اور مقفٰی ہے؟

جواب پہلی بات تو یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کلام میں بھی قافیہ کثرت کے ساتھ پایا گیا ہے اور اسی طرح عرب کا جاہلی دور ہے۔ اس دور کے تمام لوگوں کا کلام مسجع مقفٰی ہے اور صدرِ اسلام کا زمانہ بھی یہی اسلوب رکھتا ہے۔

ہمارے ان مضبوط دلائل کے سامنے معترض کے اعتراض کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی۔ اب بطور نمونے کے کچھ کلام پیش کیے جاتے ہیں:

یہ ہیں حضرت عمر بن خطاب ان کا کلام بھی اسی اسلوب کے مطابق ہے۔ آپ تاریخ طبری جلد۲، ص۲۲۲ کو دیکھ سکتے ہیں۔ آپ نے ایک خطبہ دیا۔ اس خطبے کے الفاظ یہ ہیں:

اللّٰہ قد ضرع الصغیر ورق الکبیر وارتفعت الشکویٰ،

وانت تعلم السر واخفٰی

آپ تاریخ طبری کو پڑھیں اس میں وہ مرثیہ بھی دیکھیں جو ابوحثمہ کی دختر نے حضرت عمر کی وفات پر کہا تھا۔ وہ مرثیہ سارے کا سارا مسجع ہے۔ (تاریخ طبری، ج۲، ص۲۲۶)

قیس بن ساعدہ جو جاہلی دور کا شاعر ہے اس کا کلام بھی اسی اسلوب کا ہے۔ (تاریخ ادب عربی، ج۱۲، ص۵۰ و تاریخ بغداد، ج۲، ص۲۸۱)

آپ حضرت ابوبکر کا خطبہ پڑھیں۔ آپ نے کہا:

استھدی اللّٰہ بالھدیٰ واعوذ بہ من الضلالۃ والردی،

من یھدی اللّٰہ فھو المھتدی ومن یضلل فلن تجد لہ

ولیا مرشدا

''میں اپنے اللہ سے ہدایت کی درخواست کرتا ہوں اور گمراہی و ہلاکت سے اس کی پناہ چاہتا ہوں، جس کی ہدایت اللہ کردے تو وہ ہدایت یافتہ ہو جاتا ہے اور جسے وہ گمراہ کردے تو وہ ہدایت نہیں پا سکتا''۔

اس طرح کا ان کا ایک اور خطبہ بھی ہے:

یامعشر الانصار ان شئتم ان تقولوا: او نیاکم فی
ظلالنا وشاطرناکم فی اموالنا ونصرناکم بانفسنا:
قلتم: وان لکم من الفضل ما لا یحصیه العدد وانی
طال به الامر

"اے گروہ انصار! تمہیں یہ کہنے کا حق حاصل ہے۔ آپ ہم
سے کہہ سکتے ہیں کہ اے مہاجرین! ہم نے تمہیں پناہ دی۔ ہم
نے تمہیں اپنے اموال میں حصہ دیا اور ہم نے تمہاری مدد کی۔
تمہارے ہم پر بے پناہ احسانات ہیں جن کا شمار ممکن نہیں"۔

اسی طرح کا حضرت عثمان کا خطبہ ہے:

ان لکل شیئ آفة وان لکل نعمة عاهة وفی هذا
الدین عیالون ظنانون یظهرون لکم ما تحبون
ویسرون ما تکرهون ویقولون لکم وتقولون

"ہر چیز کے لیے ایک معصیت ہے اور ہر نعمت کے لیے آفت
ہے اس دین میں بہت سے لوگ ہیں جو عیب جُو ہیں اور گمان
کرنے والے ہیں۔ تمہارے سامنے وہ ظاہر کریں گے جو پسند
کرتے ہوں گے اور اس امر کو چھپائیں گے جو انھیں پسند نہ ہوگا
وہ تم سے کہتے ہیں اور تم ان سے کہتے ہو"۔

المفید فی الادب العربی، ص ۵۱ میں جاہلی دور کے نثر کی خصوصیات کے
بارے میں لکھا گیا ہے کہ اس دور کے نثر میں قافیہ کا بہت زیادہ خیال رکھا جاتا تھا اور
نثر میں موسیقی کے اوزان کا بھی خیال رکھا جاتا تھا۔

دوسری بات یہ ہے کہ عرب اپنے مقاصد کی تعبیر میں قافیہ کا بہت زیادہ

استعمال کرتے تھے۔ قرآن کریم نے بھی ان کے لیے قافیہ کا دروازہ کھولا اور ان کے لیے اس اسلوب کے محاسن ظاہر کیے اور اس کے اثرات واضح کیے۔ آپ سورۂ واقعہ کو دیکھیں، سورۂ قمر کو دیکھیں، سورۂ ذاریات، رحمٰن اور طور کو پڑھیں، ان تمام کا اسلوب مسجع مقفیٰ ہے۔

◇ اب سوال رہا کہ کلام میں رنگینی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک ادبی صنعت ہے جو عباسی دور میں مشہور ہوئی جس کی مثالیں نہج البلاغہ میں موجود ہیں جیسا کہ مور، چمگادڑ، شہد کی مکھی، چیونٹی کے اوصاف بیان ہوئے ہیں اور اس طرح زراعت، بادل کے احوال موجود ہیں۔

تو اس سوال کے جواب میں یہ کہیں گے: اس سے قبل ہم نے بیان کیا ہے کہ قرآن مجید میں بھی اسی طرح کی تعبیرات استعمال ہوئی ہیں۔ کنایات بھی ہیں اور استعارات بھی ہیں اور اس میں وہ ادبی انداز استعمال ہوئے ہیں، جن کے سامنے قوت بشری عاجز ہے۔ تو کیا خیال ہے کہ قرآن مجید کے بارے میں آپ کہہ سکتے ہیں کہ قرآن کریم کے ادبی انداز نبوت کے دور کے مناسب نہیں تھے بلکہ اس کے انداز اس ادبی صنعت سے مربوط تھے۔ ادبی صنعت کا تعلق عباسی دور سے تھا؟

دوسری بات یہ ہے کہ قرآن کریم کے اندر جس قدر کلام موجود ہے وہ عربی ادب کی ہر صنعت سے بدرجہ اتم آراستہ و پیراستہ ہے۔ جب قرآن کا حال یہ ہے تو جو قرآن کے ربیب تھے تو ان کے کلام کا انداز وہی ہوگا جو قرآن کا ہے، کیونکہ یہ قرآن تو صامت ہے اور وہ قرآن ناطق تھے۔

جب قرآنی گفتگو ماہرین ادب عربی کو حیران کر دیتی ہے تو اس طرح امام علی علیہ السلام کا کلام بھی دنیائے عرب کو حیران کر دیتا ہے تو اسی حیرانی کے عالم میں کہنا پڑتا ہے۔ امام علیؑ کا کلام خالق کے کلام کے نیچے ہے اور تمام مخلوق کے کلام کے اُوپر ہے۔

یہ وہ عجیب لوگ ہیں جو امام علی علیہ السلام کو اپنے اُوپر قیاس کرتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ حضرت امام علی علیہ السلام بھی ان لوگوں میں سے ہے، جو قرآنی فضاؤں سے دُور رہتے تھے۔ ایسا سمجھنے والے کتنے بڑے ظالم ہیں۔ زمین کو کیا نسبت ہے رفعت سے جو آسمان کو حاصل ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ آپ نے کہا کہ نہج البلاغہ کا اسلوب بیان عباسی دور کا اسلوب بیان ہے یہ بالکل غلط ہے۔ کیونکہ اس سے قبل ہم نے ثابت کیا ہے کہ دورِ جاہلی کو دیکھیں اور اس دور کی نثر کو دیکھیں تو آپ کو یہی اسلوب نظر آئے گا جس پر ابھی آپ نے اعتراض کیا ہے۔

آپ نثر کے علاوہ دورِ جاہلی کی نظم کو دیکھیں جیسا کہ سبعہ معلقہ ہے۔ اس طرح بانت سعاد کا قصیدہ ہے تو یہ صنعت عباسی دور کی ایجاد نہیں ہے بلکہ یہ صنعت دورِ جاہلی کی ہے۔

نہج البلاغہ کا اپنا ادبی انداز ہے، جس کے سامنے کائنات عاجز ہے۔

۸ معترض نے کہا ہے کہ نہج البلاغہ میں فلسفیانہ بحثیں ہیں اور علمِ کلام کے مقالات ہیں۔ فلسفہ ہو یا علمِ کلام، ان علوم سے مسلمان اس وقت متعارف ہوئے جب یونانی کتب کا عربی زبان میں ترجمہ ہوا۔ نہج البلاغہ کے مقالات منطقیوں اور فلاسفہ کے کلام سے مشابہہ ہے حالانکہ حضرت امام علی علیہ السلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابی تھے۔ ان کے شاگرد تھے اور اہلِ بیتؑ کے فرد تھے۔

اس سوال کے ضمن میں یہ کہیں گے کہ جن لوگوں نے یہ اشکال کیا ہے انھوں نے حضرت امام علی علیہ السلام کو سمجھا نہیں۔ ان لوگوں نے امامؑ کو باقی لوگوں کی طرح خیال کیا کہ جیسے وہ تھے، آپؑ بھی شاید ویسے تھے۔ جس طرح ان کے سینے علم کی روشنی سے خالی تھے، اس طرح امام بھی علم سے دُور تھے۔ اس طرح کی فکر رکھنے والے اپنی فکر

سمیت غلطی پر ہیں۔ ہم یہ عرض کریں گے حضرت امام علی علیہ السلام ان لوگوں کی طرح نہیں تھے۔ آپؑ ان سے ہر اعتبار سے جدا تھے۔ آپ اپنی ہر صفت میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ نہ علم میں، نہ شجاعت میں، نہ فضل میں اور نہ زُہد میں۔

ان کے سامنے آنے کی کون جرأت کرسکتا ہے۔ آپ تو وہ تھے کہ جس کے پاس کتاب کا علم تھا۔ آپ کی ذات والاصفات تو وہ تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آپ کو علم کا ایک ہزار باب تعلم کیا تھا۔ آپؑ نے ہر باب سے ہزار ہزار علم کے باب کھول لیے تھے۔

یہ وہ حقیقت ہے، جس کا انکار کوئی کرسکتا ہی نہیں۔ آپ کے علم کا اقرار آپ کے دشمنوں نے آپؑ کے دوستوں سے پہلے کیا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ہمارے لیے یہ تو ضروری ہوا کہ ہم تیسری صدی ہجری کے دَور کو دیکھیں کہ اس دور میں جو یونانی اصطلاحات اسلام کے اندر آئیں، ان سے مسلمان متاثر ہوئے اور یونانی علوم نے ان میں انقلاب برپا کیا۔ عجیب ہے کیا قرآنی علوم نے مسلمانوں پر کوئی اثر نہ کیا؟ کیا مدرسہ قرآن بے نتیجہ رہا۔ اس نے انسانی معاشرے میں کوئی تبدیلی پیدا نہ کی؟

افسوس ہے کہ یونانی علوم تو مسلمانوں کو متاثر کر جائیں اور قرآنی علوم کچھ بھی اثر نہ کر پائیں۔ یہ عجیب فکر ہے نامعلوم کہاں سے پیدا ہوئی؟

تیسری بات یہ ہے کہ جو نہایت افسوس سے کہنا پڑتی ہے کہ نہج البلاغہ میں یونانی اصطلاحات ہیں جن سے تیسری صدی ہجری میں مسلمان متعارف ہوئے جو آپ کے کلام میں وارد ہوئیں۔ حالانکہ نہج البلاغہ میں ہم نے کہیں بھی ایسی اصطلاحات نہیں دیکھیں۔ جی ہاں! نہج البلاغہ میں وہ تعبیرات کثرت کے ساتھ ہیں جن کا تعلق قضایا علمی کے ساتھ ہے اور اس کا ہر علمی قضیہ حقیقت پر مبنی ہے اور دلائل

سے آراستہ و پیراستہ ہے۔

آیئے حضرت امام علی علیہ السلام کے خطبے کا ایک انداز دیکھتے ہیں:

این الدین فلا یقال این وکیف الکیف فلا یقام له الکهف

آپؑ نے فرمایا:

لیس لصفته حد محدود ، ولا نعت موجودٌ ولا وقت معدود ولا اجل ممدود

اُس کی کسی صفت کو محدود نہیں کیا جا سکتا۔

نہج البلاغہ امام علی علیہ السلام کا وہ کلام ہے، جس میں کہیں بھی یونانی اصطلاحات نہیں پائی جاتیں اور نہ اُس کے علاوہ کوئی اور اصطلاحات ہیں۔ اس کے اندر وہ حقائق بیان ہوئے ہیں جن سے کوئی انکار نہیں کر سکتا اور ایسے دلائل ہیں، جن سے کوئی فرار نہیں کر سکتا۔

◈ معترض نے کہا ہے کہ نہج البلاغہ مسلمانوں میں تیسری صدی ہجری میں متعارف ہوئی۔ جی ہاں! یہ بات ٹھیک ہے کہ تیسری صدی ہجری میں متعارف ہوئی لیکن اس کا یہ مقصد نہیں کہ ان خطبات کو تیسری صدی ہجری سے قبل کوئی جانتا ہی نہیں تھا۔ امام علی علیہ السلام کے خطبات اور آپؑ کے کلام سے اہلِ نظر متعارف تھے۔ حضرت امام علی علیہ السلام کا کلام نہج البلاغہ کی صورت میں تیسری صدی ہجری میں اشاعت ہوا، جو آج ہمارے ہاتھوں میں ہے۔

ظہورِ امام مہدی علیہ السلام سے قبل پرچموں کا بلند ہونا

سوال آپ نے یہ روایات دیکھی ہوں گی کہ امام مہدی علیہ السلام کے قیام سے قبل جو پرچم بلند ہوگا، وہ طاغوت کا پرچم ہوگا اور گمراہی و ضلالت کا پرچم ہوگا......الخ۔

ا- کیا یہ روایات جہاد اسلامی اور عدالت الٰہیہ سے موافقت رکھتی ہیں؟ آپ کو معلوم ہے جہاد اسلام کا اہم ترین رکن ہے اور اس رکن کے قیام کے لیے امام علی علیہ السلام کس قدر سختی سے پابند تھے؟

ب- کیا یہ روایات اس اہم رکن جہاد کی ضد نہیں ہیں؟

جواب جو کچھ آپ نے لکھا ہے تو میں ان روایات کا تجزیہ آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں، ملاحظہ فرمائیں:

① یہ وہ روایات ہیں، جن کے راوی اہلِ سنت سے تعلق رکھتے ہیں اور ان میں یہ کہا گیا ہے کہ چاہے حالات جو بھی ہوں تو ان حالات میں قائم سے قاعد بہتر ہے اور خیر پر ہے..... الخ۔ اسی طرح کی اور روایات بھی ہیں، جن کا مضمون یہی ہے کہ جب فتنے پیدا ہوں اور حقوق کو روندا جا رہا ہو تو اپنے حق کے دفاع کے لیے قیام گناہ ہوگا۔ کیونکہ دفاع جائز نہیں ہے۔ جی ہاں! اگر تمہارے گھر میں تمہاری اجازت کے بغیر کوئی داخل ہو جائے تو تمہارے لیے جائز نہیں ہے کہ تم اپنا دفاع کرو اور اُسے روکو۔

یہ وہ روایات ہیں، جن پر کسی صورت میں اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ چند توجیہات ملاحظہ فرمائیں:

ا- یہ سب سند کے لحاظ سے ساقط ہیں۔

ب- ایسے عقیدہ سے فتنے پیدا ہوتے ہیں، جب فتنے پیدا ہو جائیں تو حق کو نہیں پہچانا جا سکتا۔ جب حق واضح ہوگا تو حق کا ساتھ دینا واجب ہو جائے گا۔

ج- یہ نظریہ ہر اس تحریک کو روکنے والا ہے جو مظالم کے دفع کے لیے چلائی جانے والی ہوں۔

د- یہ نظریہ اس امر کی تعلیم دیتا ہے کہ سلطان جابر پر خروج نہ کیا جائے اور اس کی اطاعت واجب سمجھی جائے۔ اہلِ بیتؑ نے اس نظریہ کا انکار کیا۔ یہ نظریہ آیات

خداوندی کی نفی کرتا ہے اور ظلم و ظالمین کی پشت پناہی کی دعوت دیتا ہے۔

۵- یہ نظریہ انسان کو یہ تعلیم دیتا ہے کہ وہ اپنا دفاع نہیں کر سکتا۔ دفاع کرنا اس کے لیے حرام ہے، حتیٰ کہ اس کا قاتل اس کے گھر میں داخل ہو جائے تو وہ اپنا دفاع نہ کرے۔ ایسا نظریہ نظامِ فطرت کے بھی مخالف ہے۔ شریعت اور دین اسلام کی ضروریات کی ضد ہے۔

۲ دوسری بات یہ ہے کہ ایسا نظریہ گھڑ کر انھوں نے اس سے یہ استدلال کیا کہ زمانۂ غیبت میں ظالموں پر خروج حرام ہے۔ اس مضمون کی ایک اور حدیث ہے جب دو مسلمان ایک دوسرے پر اپنی اپنی تلواریں کھینچیں تو اس صورت میں قاتل اور مقتول دونوں جہنم میں جائیں گے۔ ایسے عقائد نے دین کے قیام کی تحریکوں کو کمزور کیا اور حق کے اظہار سے منع کیا۔ اسلامی معاشرہ میں ایک فقیہ عادل، جامع الشرائط جس کو نائب امام کہا جاتا ہے اس کے نظام پر ضرب مارنے کے لیے ایسی روایات گھڑی گئیں۔ یہ نظریہ اپنی دنیا بنانے کے لیے بنایا گیا اور اللہ کی مخلوق پر تسلط قائم کرنے کے لیے ایسا کیا گیا۔

۳ وہ احادیث جن میں مومنین کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنے گھروں میں اس وقت تک بند رہیں، جب تک صاحبِ غیبت کا ظہور نہ ہو۔ (تاریخ الکبریٰ، ص ۴۰۵ و غیبتِ طوسی، ص ۱۶۳ و بحار، ج ۵۲، ص ۱۳۶، ۱۳۵ و اثبات الہداۃ، ج ۳، ص ۵۰۰)

ایک حدیث حضرت امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپؑ نے فرمایا: آذربائیجان سے آگ بھڑکے گی جب ایسا ہو تو تم اپنے گھروں میں بند رہنا۔ تم اس طرح اپنے گھروں میں رہنا، جس طرح کہ ہم رہ رہے ہیں۔ ہاں اگر ہمارا کوئی تحریک چلائے تو تم اس کی طرف بھاگ کر آنا۔ (غیبت نعمانی، ص ۱۹۴ و بحار، ج ۵۲، ص ۱۳۵)

اور اسی مقصد کے قریب جناب امیر علیہ السلام کا خطبہ نہروان ہے۔ آپؑ

نے فرمایا:

إِنَّ الْفِتَنَ إِذَا أَقْبَلَتْ شَبَّهَتْ

"فتنوں کی صورت یہ ہوتی ہے کہ جب وہ آتے ہیں تو اس طرح اندھیرے میں ڈال دیتے ہیں"۔

اس فرمان کے بعد آپؑ نے فتنوں کا تذکرہ فرمایا۔ اس دوران ایک آدمی کھڑا ہو گیا اور عرض کیا: یا امیر المومنینؑ! اس زمانے میں ہمارا وظیفہ کیا ہوگا؟

آپؑ نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہلِ بیتؑ کو دیکھنا۔ اگر وہ گھروں میں بیٹھے رہیں تو تم بھی اپنے گھروں میں رہنا۔ ہاں اگر وہ تم سے نصرت طلب کریں تو تم ان کی نصرت کرنا تاکہ تم اُجرت پروردگار کے مستحق ہو جاؤ۔ ان پر سبقت نہ کرنا ورنہ مصائب تمہیں پچھاڑ کر رکھ دیں گے۔ پھر آپؑ نے قائم آلِ محمدؑ کا ذکر فرمایا۔ ان کے خروج کے ساتھ مصائب کے بادل چھٹ جائیں گے۔ (الوسائل، باب ۱۳، ج ۱، ص ۱۳-۱ و نہج البلاغہ و کتاب سلیم بن قیس، ص ۱۵۶)

اس گفتگو سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شیعیانِ اہلِ بیتؑ کو ان کی حفاظت کا خط دیا گیا ہے کہ ان حالات میں تم نے یہ کرنا ہے، اس میں تمہاری حیات ہے۔ اس امر کی بھی نشان دہی کی گئی ہے کہ الٰہی رہبر اہلِ بیت رسولؐ ہیں اور ان کی علامات بتائی گئی ہیں۔ لوگوں کو دعوت دی گئی ہے کہ تم ان پر نگاہ رکھنا، ان کے فرامین پر عمل کرنا اور ان کے ساتھ خروج کرنا اور آپؑ نے اپنے خطبہ میں حضرت امام مہدی علیہ السلام کی امامت و رہبری کی تصدیق فرمائی ہے اور آپؑ نے حقیقی مہدیؑ کی یہ علامت بتائی ہے کہ جب وہ ظہور کریں گے تو آذربائیجان سے آگ بلند ہوگی۔

علاوہ ازیں امام علیہ السلام نے لوگوں کو اہلِ بیتؑ سے مربوط رہنے کی تلقین فرمائی۔ اس لیے آپؑ نے فرمایا: جب تک ہم گھروں میں ساکن رہیں تم بھی گھروں میں

ساکن رہنا۔ جب ہماری طرف سے تحریک ہو تو تم دوڑ کر آنا......الخ۔ مزید وضاحت کے لیے یہ عرض کریں گے:

أ- جناب امیر علیہ السلام کے خطبے کی توضیح یہ بھی ہے کہ جب فتنے پھوٹیں تو اس وقت بندگانِ خدا کی ذمہ داریاں کیا ہوں گی کیونکہ فتنے ہر طرف تاریکی کا باعث ہوتے ہیں اور حق چھپ جاتا ہے اس لیے امامؑ نے انھیں فتنوں کے بارے فرمایا:

اذا اقبلت شبہت......الخ

آپؑ نے یہ بھی فرمایا: جب حق معلوم ہو جائے تو پھر حق کا دفاع واجب ہوگا کیونکہ حق کا دفاع ایک شرعی وجوب ہے۔

ب- حضرت امام علی علیہ السلام نے حکم فرمایا تھا کہ جب فتنے اپنا سر اُٹھائیں تو تم اپنے آئمہ کے فرامین پر چلنا اور اپنی مرضی نہ کرنا۔

۲ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت ہے، آپؑ نے ابوجارود سے فرمایا: میں تمھیں تقویٰ کی وصیت کرتا ہوں۔ تم اپنے گھر کو لازم پکڑو۔ اس وقت ہم اہلِ بیتؑ میں سے جو خروج کرے، اس کا ساتھ نہ دینا، انھیں کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ تمھیں معلوم ہونا چاہیے اس وقت بنواُمیہ حاکم ہیں۔ لوگوں میں استطاعت نہیں ہے کہ یہ حکومت ان سے چھین سکیں۔ ہاں اہلِ حق کے پاس حکومت آئے گی۔ اللہ تعالیٰ ہم اہلِ بیتؑ میں سے جس کو چاہے گا حکومت عطا کرے گا اور جس نے اس زمانے کو پایا تو وہ محترم و مکرم ہوگا۔ اگر کوئی اس زمانے میں اس دنیا میں موجود نہ ہوا تو جان لو یہ خروج کرنے والے ظلم کو دُور نہ کر سکیں گے اور نہ دین کو غلبہ دے سکیں گے۔ مصائب زمانہ انھیں پچھاڑ کر رکھ دیں گے۔ ہاں جلد ایک زمانہ آئے گا کہ ایک جماعت قیام کرے گی۔ ان کی عزت و عظمت اہلِ بدر کے برابر ہوگی۔ ان کا مقتول نہیں چھپایا جاسکے گا اور نہ ان کا پچھاڑا جانے والا بلند کیا جاسکے گا اور نہ ان کے زخمیوں کا علاج ہوگا۔ (راوی کہتا ہے کہ

وہ کون ہوں گے؟)

آپؑ نے فرمایا: وہ ملائکہ ہوں گے۔

اس روایت کی توضیح یہ ہے: پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ روایت ضعیف ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس روایت میں ابوجارود کو روکا گیا ہے کہ وہ قبل از قائم آلِ محمدؑ ان لوگوں کے ساتھ خروج نہ کریں جو امیرالمومنین علیہ السلام کی اولاد سے ہیں۔

جی ہاں! اہلِ بیتؑ کے جن لوگوں نے خروج کیا ان میں سے اکثر حضرت امام حسن علیہ السلام کی اولاد سے تھے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ وہ اُمت کی قیادت کا حق رکھتے ہیں۔ وہ اس امر قیادت کو آئمہ اثنا عشر سے مربوط نہیں سمجھتے تھے کہ اُمت کی رہبری امام حسین علیہ السلام کی اولاد نے کرنی ہے۔ آخر ایک وقت آیا کہ محمد بن عبداللہ بن حسن نے مہدی موعود کا دعویٰ کر ہی دیا کہ وہ اس اُمت کے مہدی ہیں۔ امام جعفر صادق علیہ السلام اور ان کے شیعوں کے علاوہ ایک گروہ نے ان کی بیعت کر لی۔

اس تمام گفتگو کا خلاصہ یہی ہوا کہ امام علیہ السلام نے ابوجارود کو واضح انداز میں فرمایا۔ یہ خروج کرنے والے کچھ بھی نہیں ہیں۔ انھیں کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

آپؑ نے یہ بھی فرمایا کہ ایک دور جس میں آلِ محمدؑ کو حکومت ملے گی وہ آخری زمانہ ہوگا۔ اس زمانے میں قائم آلِ محمدؑ ظہور فرمائیں گے۔

تیسری بات یہ ہے کہ امام علیہ السلام نے ان خروج کرنے والوں کے بارے میں فرمایا کہ یہ لوگ جو مظالم کے خاتمے کے لیے اور دین کی سربلندی کے لیے اُٹھ رہے ہیں۔ یہ مصائب و آلام کا شکار ہوں گے۔ آپؑ نے ان کی مذمت نہیں فرمائی۔

آخر میں آپؑ نے ایک ایسی جماعت کی خبر دی جو حقیقی قیام میں حصہ لینے والے ہوں گے۔ آپؑ نے ان کی مدح فرمائی کہ ان کا مقام اہلِ بدر کے مقام کے برابر ہوگا۔ کیونکہ وہ ملائکہ میں سے ہوں گے یا اس سے مراد یہ ہے کہ ان کی منزلت

ملائکہ کے برابر ہوگی یا آپؑ یہ فرمانا چاہتے تھے کہ ملائکہ ان کے ساتھ جنگ میں شرکت کریں گے۔

۵ ابو مرھف نے حضرت امام صادق علیہ السلام سے روایت کی ہے، آپؑ نے فرمایا: محاضیر ہلاک ہو گئے ہیں۔

میں نے عرض کیا: محاضیر کون ہیں؟

آپؑ نے فرمایا: وہ لوگ جو جلدی کرنے والے ہیں۔ وہ لوگ جو ہمارے قریب ہوئے، انھوں نے نجات پائی۔ تم اپنے گھروں میں بند رہنا، فتنے سربلند ہوں گے، وہ لوگ تمھیں اپنی ضرورت کے لیے استعمال کرنا چاہیں گے۔ اللہ تعالیٰ انھیں معاملات میں مصروف کر دے گا۔ (البحار، ج ۵۲، ص ۱۳۸، الغیبۃ النعمانی، ص ۱۶۱، ۱۹۷، روضۃ الکافی، ص ۲۲۹، الوسائل، ج ۱۵، ص ۵۲۰ من ابواب الجہاد، باب ۱۳)

حضرت امام صادق علیہ السلام نے فرمایا: اپنی زبانوں کو بند رکھو اور اپنے گھروں میں بند رہو تو تم ہمیشہ لڑائی جھگڑوں سے محفوظ رہو گے۔

امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا: اصحاب محاضیر ہلاک ہو گئے اور ہمارے قریب رہنے والے نجات پا گئے۔

اب ہم اس ضمن میں یہ عرض کریں گے کہ پہلی بات تو یہ ہے کہ ابو مرھف والی حدیث ضعیف ہے کیونکہ اس حدیث کا حاصل یہ ہے کہ فتنوں میں داخل ہو جاؤ۔ حالانکہ یہ امر واضح ہے کہ جب ہر طرف سے فتنوں کی اندھیریاں چل رہی ہوں تو اس وقت حق کو نہیں پہچانا جا سکتا کیونکہ ایک مومن کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ کسی ایک فریق کی مدد کرے جس کے بارے علم ہی نہ ہو کہ آیا وہ حق پر ہے یا نہیں؟ بلکہ مومنین پر واجب ہے کہ وہ اپنے آپ کو ان فتنوں سے دُور رکھیں اور اپنے آپ کو گھروں میں بند رکھیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ امامؑ نے شیعوں سے یہ فرمایا: تم پر واجب ہے کہ تم عجلت

کا کھیل بن جائے گا۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ ابھی جو بحث ہم نے کی ہے اُسے دُہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ بات ہو رہی تھی ان لوگوں کی جو آلِ رسولؐ میں سے تھے جنھوں نے دعویٰ کیا تھا کہ وہ امام ہیں اور انھیں انتقام کا حق حاصل ہے اسی بنیاد پر وہ لوگوں سے خروج کا مطالبہ کرتے تھے اور ان سے اسی خروج کے لیے نصرت چاہتے تھے تاکہ ظالمین کا خاتمہ ہو۔ ان لوگوں کا مقصد صرف یہی تھا کہ وہ دین کی سربلندی اور شعائر اللہ کی اقامت سے مقصد نہیں رکھتے تھے۔ اور وہ لوگ جو حق و حقیقت کو جانتے تھے تو وہ آئمہ اہلِ بیتؑ کی امامت کا اعتراف کرتے تھے اور ان کے احکام کو اپنے اُوپر لازم جانتے تھے اور ہر اُس بات سے رُک جاتے تھے، جس سے انھیں روکا جاتا تھا۔

ان سوالات کا مقصد یہ ہے کہ یہ لوگ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ حضرت امام حسین علیہ السلام کی نہضت صحیح نہیں تھی۔ یہ ان لوگوں کا اپنا خیال ہے کہ حضرت امام حسین علیہ السلام کا جہادِ کربلا دینِ خداوندی کی سربلندی و بقا کے لیے تھا۔

دوسری بات یہ ہے کہ آلِ محمدؐ سے کچھ وہ لوگ سامنے آئے جنھوں نے حکومت حاصل کی جیسا کہ فاطمی ہیں۔ انھوں نے کامیابی حاصل کی۔

⑦ صحیفہ سجادیہ میں امام علیہ السلام کا فرمان موجود ہے۔ آپؑ نے فرمایا: ہم اہلِ بیتؑ میں سے جو فرد ہمارے قائمؑ کے قیام سے قبل ظلم کے خلاف اور حق کے دفاع کے لیے خروج کرے گا تو وہ مصائب میں جا پڑے گا۔ اُس کا قیام ہمارے اور ہمارے شیعوں کے مصائب میں اضافہ کرے گا۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ حدیث اپنی سند کے لحاظ سے ضعیف ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ خروج کی وجہ سے مصائب میں جا پڑنا حرام نہیں ہے۔ کبھی ایک امر مکروہ اپنی کیفیت کے اعتبار سے حرام ہو جاتا ہے اور کبھی اس کا ادا کرنا

واجب ہو جاتا ہے۔

اگر ہم اس روایت کو صحیح مان لیں تو اس کا مقصد یہ ہے کہ اس روایت کے مصداق اہلِ بیتؑ کے وہ افراد ہیں، جن کا امامت سے واسطہ نہیں ہے۔ آئمہ طاہرینؑ اس روایت کے مصداق سے خارج ہیں کیونکہ لفظ "مکروھنا" میں جو متکلم کی ضمیر ہے اس کا مرجع آئمہ طاہرینؑ ہیں۔

۵ حضرت امام محمد باقرؑ نے فرمایا: جب تک زمین و آسمان ساکن ہیں تم بھی ساکن رہو، کسی پر خروج نہ کرو۔ تمہارا معاملہ مخفی نہیں رہے گا۔ ہاں اس وقت جب اللہ تعالیٰ کی آیت آجائے۔ یہ وہ آیت خداوندی ہوگی، جو لوگوں پر سورج سے زیادہ منور ہوگی جو کسی پر مخفی نہ رہے گی، نہ نیک پر اور نہ فاجر پر۔ (البحار، ج ۵۲، ص۱۳۹و۱۴۰)

اس روایت کا مقصد یہ بھی ہے کہ امامؑ نے لوگوں کو اس امر کی ہدایت فرمائی کہ جھوٹے مدعیان مہدویت سے بچے رہو۔ کہیں دھوکے میں نہ آجاؤ۔ آپ نے حقیقی مہدیؑ کے ظہور کی علامات بیان فرمائیں کہ آسمان سے ندا آئے گی اور لشکر کے دھنس جانے کی علامات بیان فرمائیں۔ کیونکہ یہ آیات اللہ ہیں اور خداوند تعالیٰ ان علامات کو اس لیے ظاہر فرمائے گا تاکہ لوگوں پر حقائق واضح ہوجائیں اور دھوکے سے محفوظ رہیں۔ اس لیے ایسے خروج کو جائز قرار نہیں دیا گیا جس خروج کے لیے یہ آیات ظاہر نہ ہوں۔

۶ حسین بن خالد کی روایت کا مضمون بھی یہی ہے۔ اُس نے کہا: میں نے حضرت امام رضاؑ کی بارگاہ میں عرض کیا: میرے پاس ایک حدیث ہے جس کے راوی عبداللہ بن بکیر ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کے حضور وہ حدیث بیان کروں۔

آپؑ نے فرمایا: ہاں بیان کرو وہ حدیث کیا ہے؟

میں نے عرض کیا: عبداللہ بن بکیر نے کہا: مجھے عبیداللہ بن زرارہ نے بیان کیا۔ اُس نے کہا: میں حضرت امام صادق علیہ السلام کی بارگاہ میں تھا یہ اُس زمانے کی بات ہے جس زمانے میں محمد بن عبداللہ بن حسن نے خروج کیا تھا۔ تو اس وقت ہمارا کوئی آدمی امام علیہ السلام کے پاس آیا تو آپؑ نے فرمایا:

جب تک زمین و آسمان ساکن ہیں تم بھی سکون کے ساتھ رہو تو اس وقت عبداللہ بن بکیر نے عرض کیا: جب معاملہ یہ ہے اور اُس وقت تک خروج نہیں ہوگا جب تک آسمان وزمین ساکت رہیں۔ تو پھر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قائمؑ اور اُس کے خروج کی بات ہے ہی نہیں؟

اس کے جواب میں امام رضا علیہ السلام نے فرمایا: جو کچھ امام صادق علیہ السلام نے فرمایا وہ سچ ہے۔ اے ابن بکیر! جو تاویل تم نے کی ہے، معاملہ اس طرح کا نہیں ہے۔ امام صادق علیہ السلام نے فرمایا تھا: تم اس وقت تک آرام کے ساتھ رہو، جب تک آسمان ندا سے خاموش ہے اور زمین میں لشکر نہیں دھنستا۔ (الوسائل، ج۵، ص ۵۵، باب ۱۳)

اسی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں یہ گذشتہ روایت اس بات کی نشان دہی کرتی ہے کہ وہ لوگ جو اس ماحول میں رہتے تھے، جس ماحول میں لوگ مہدی موعود ہونے کا دعویٰ کر رہے تھے حالانکہ وہ غیر صادق تھے۔ اس لیے امام علیہ السلام نے حکم دیا کہ اس قاعدہ کو اپنے اُوپر لازم کرو، جس قاعدہ سے تمھیں حقیقی مہدی کی معرفت حاصل ہو۔ یہ قاعدہ جو امامؑ نے بیان فرمایا: اس قاعدہ سے جھوٹے مدعیان مہدویت کی نشان دہی ہو جاتی ہے کیونکہ ان کے دعویٰ کے لیے وہ آیاتِ الٰہیہ نازل نہیں ہوئیں، جن سے ان کی تصدیق ہو سکے۔ ان علامات میں سے ایک آسمانی آواز ہے اور دوسری لشکر کا زمین میں دھنس جانا ہے۔

⑨ محمد بن یحییٰ نے احمد بن محمد سے سنا، اُس نے حسین بن سعید سے، اُس

نے حماد بن عیسیٰ سے، اُس نے حسین بن مختار سے، اُس نے ابوبصیر سے، اُس نے حضرت امام صادق علیہ السلام سے سنا، آپؑ نے فرمایا: ہر وہ پرچم جو قیامِ قائمؑ سے قبل بلند ہوگا وہ پرچم طاغوت کا ہوگا اور یہ طاغوت اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور کی عبادت کرنے والا ہوگا۔ روایت کی سند اظہر قول کے مطابق صحیح ہے۔ (بحار، ج ۵۲، ص ۱۴۳۔ کافی سے روایت کی ہے، ج ۱، ص ۹۔ الوسائل، ج ۵، ص ۵۲۱، باب ۱۳)

اب اس روایت کو اس صورت میں دیکھا جاسکتا ہے:

① جن پرچموں کی طرف اشارہ ہوا ہے تو ان کے بارے یہ کہا گیا ہے ان پرچموں میں کچھ ایسے پرچم ہوں گے جو گمراہ لوگوں نے اُٹھائے ہوئے ہوں گے۔ اسی بات کی طرف امام علیہ السلام نے ایک اور حدیث میں اشارہ فرمایا ہے۔

کوئی ایک ایسا نہیں ہے جو اس وقت دعویٰ کرے جب دجال خروج کرے مگر وہ یہ دیکھے گا کہ کون ہے، جو اُس کی بیعت کرے اور جس نے ضلالت کا پرچم اُٹھایا تو اُس کا اُٹھانے والا طاغوت ہوگا۔

② دوسری بات یہ ہے کہ اسی امر کی تاکید ہوگئی کہ امام علیہ السلام نے پرچم کی بات کی۔ پھر اُس کے اُٹھانے والے کے اوصاف بیان فرمائے کہ وہ طاغوت ہوگا اور اللہ کے علاوہ کسی اور کی عبادت کرے گا اور وہ امامِ حق کی تائید پر راضی نہیں ہوگا۔ جس طرح کہ اشارہ کیا گیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور کی بندگی کرے گا۔ اس لیے اس امر کی وضاحت کردی گئی کہ وہ طاغوت اپنے اقوال کو اس صورت میں پیش کرے گا کہ یہی دین ہے اور یہی شریعت ہے اور اسے تسلیم کرو اور اس کو مقدس جانو۔

③ تیسری بات یہ ہے کہ یہ روایت جناب زید کے حوالے سے بیان کی گئی ہے جو پرچمِ حق اور پرچمِ ضلالت کے درمیان فرق کو واضح کرتی ہے اور اس نے جناب زید اور ان کے غیر کے قیام کے درمیان فرق واضح کردیا۔

اس طرح کی ایک اور روایت موجود ہے۔ حضرت امام رضا علیہ السلام سے روایت کی گئی۔ آپؑ نے فرمایا: حضرت امام صادق علیہ السلام نے فرمایا: خداوند تعالیٰ میرے چچا زید پر رحم نازل فرمائے۔ انھوں نے رضائے آلِ محمدؐ کی دعوت دی تھی۔ اگر آپ کامیاب ہوجاتے تو اپنی دعوت کو پورا فرماتے۔ اسی طرح حضرت امام رضا علیہ السلام نے مامون سے فرمایا تھا۔ جنابِ زید نے حق کے علاوہ کسی اور بات کی طرف دعوت نہیں دی تھی۔ وہ اپنی ذات کے معاملہ میں اللہ سے ڈرتے تھے۔ انھوں نے لوگوں سے فرمایا تھا: میں تمھیں رضائے آلِ محمدؐ کی دعوت دیتا ہوں۔ پھر ان مدعیان کے بارے میں جو کچھ تاریخ نے بیان کیا ہے سو کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس امرِ دعوت پر نص جاری فرما دی ہے۔ جب کوئی اللہ کے دین کے علاوہ کسی اور کی دعوت دے گا تو وہ گمراہ ہوگا۔

④ چوتھی بات یہ ہے عیص بن قاسم کی روایت ہے جو صحیح ہے اس حدیث سے ہمارے لیے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آئمہ ہدیٰ نے لوگوں کو کس طرح روکا کہ وہ ان جھوٹے مدعیان کی دعوت پر کان نہ دھریں۔ یہ لوگ اپنے نفس کی دعوت دیتے ہیں اور اپنے دعووں میں جھوٹے ہیں۔

امام علیہ السلام نے فرمایا: بخدا! اگر تم لوگوں کے دو نفس ہوتے اور ایک دوسرے کے ساتھ لڑتے اور ان میں سے ایک قتل ہوجاتا اور دوسرا باقی رہ جاتا تو وہ وہی عمل کرتا جو اس کے لیے ظاہر ہوتا لیکن نفس تو ایک ہے، دوسرا ہے ہی نہیں۔ اگر یہ ختم ہوجائے تو توبہ ختم ہوجائے۔ تم اپنے نفوس کے معاملے میں زیادہ حق رکھتے ہو۔ اگر ہماری طرف سے تمھارے پاس کوئی خبر پہنچے تو تم دیکھنا کہ تم نے کس صورت میں خروج کرنا ہے۔ تمھیں یہ نہیں کہنا چاہیے کہ جنابِ زید نے خروج کیا۔ وہ تو ایک عالم تھے، صدوق تھے۔ انھوں نے اپنے نفس کی دعوت نہیں دی تھی بلکہ انھوں نے تمھیں رضائے آلِ محمدؐ کی دعوت دی تھی۔ اگر وہ کامیاب ہوجاتے تو اپنی دعوت کو پورا کرتے۔

جتنی روایات اس مضمون پر مشتمل ہیں۔ ان سب کا اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ حقیقی قائم آلِ محمدؐ سے قبل خروج نہ کیا جائے۔ آئمہ طاہرینؑ نے اس امر پر زور دیا کہ لوگوں پر واجب ہے کہ وہ امر مہدی کو وقت کے ساتھ دیکھیں اور اُس حقیقت کو اپنائیں جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے آیات معین کی ہیں۔ اس لیے معصومؑ نے یہ بھی فرمایا: ظہور قائمؑ کی ایک علامت سفیانی بھی ہے وہ تمہارے لیے کافی ہے۔ (الوسائل، ج ۱۵، ص ۵۰ و ۵۱ و باب نمبر ۱۳، جہاد الکافی، ص ۲۱۹ و ۲۲۰)

یہ صحیح روایات اس امر کی طرف بھی اشارہ کرتی ہیں کہ جب حقیقی قائمؑ کا ظہور ہو جائے تو تم اس کی نصرت کرنا۔ اسی مضمون سے جناب زید کا واقعہ مربوط ہے وہ صرف اور صرف اس لیے اُٹھے تھے کہ ان ظالموں سے معاشرے کو چھٹکارا ملے۔

روایت اس فرق کو واضح کر رہی ہے کہ پرچم حق کیا ہے اور پرچم ضلالت کیا ہے؟

⑤ اس ضمن میں وہ روایات بھی ہمارے سامنے ہیں، جن میں یمانی کے خروج کا ذکر ہے۔ اس کے خروج کی مدح کی گئی ہے کہ اس کا پرچم پرچم ہدایت ہوگا، یہ پرچم بھی قائمؑ کے پرچم سے قبل بلند ہوگا حالانکہ مندرجہ بالا روایت کا ظاہر یہ بتا رہا ہے کہ قبل از قیام قائم ہر پرچم ضلالت کا پرچم ہوگا۔

یمانی کے پرچم کی مدح یہ بتاتی ہے کہ اس کا خروج جائز ہوگا۔ وہ حکام جور کے خلاف جہاد کریں گے۔ ان کے خاتمے کے لیے اور اللہ تعالیٰ کے حکم کو قائم کرنے کی کوشش کریں گے۔ (الغیبۃ النعمانی، ص ۱۷۱، حدیث ۱۳)

اس ضمن میں وہ روایات بھی ہیں جن میں ان پرچموں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، جو مشرق کی طرف سے اُٹھیں گے اور وہ حق کا مطالبہ کریں گے۔ ان پرچموں کی بھی مدح کی گئی ہے۔ ان کی مدح ان کے خروج کے جواز کی دلیل ہے۔ (غیبت نعمانی، ص ۱۸۲، باب ۱۴، حدیث ۵۰)

اس طرح کی ایک روایت قم کے رجل کے بارے میں بھی ہے۔ قم کی ایک شخصیت ہوگی، جس کے ساتھ ایک قوم ہوگی، جو سیسہ پلائی دیوار کی مانند ہوگی۔ یہ دلیل ہے کہ وہ لوگ حق پر ہوں گے۔

اس آیت مقدسہ فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ أُولَاهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَنَا أُولِي بَأْسٍ شَدِيدٍ (الاسرا:۵۔ ''پس جب دونوں میں سے پہلے وعدے کا وقت آیا تو ہم نے اپنے زبردست طاقتور جنگ جُو بندوں کو تم پر مسلط کیا'') کی تفسیر امامؑ سے پوچھی گئی تو آپؑ نے تین مرتبہ فرمایا: اللہ کی قسم اس آیت کے مصداق اہلِ قم ہیں۔ (بحار، ج ۵۴، ص ۱۴۴، نہج البلاغہ، ۱۹۰)

ان لوگوں کی مدح وتعریف اس امر کی دلیل ہے کہ زمانِ غیبت میں ان کا قیام شریعت ربانی کے مطابق ہوگا۔

⑥ حضرت امام علی علیہ السلام کا فرمان ہے: ''زمین کو تھامے رکھنا اور مصائب پر صبر کرنا اپنے ہاتھوں اور اپنے اسلحہ کو حرکت میں نہ لانا جب تک خداوند تعالیٰ تمہارے لیے جلدی نہ کرے تم بھی عجلت سے کام نہ لینا، ان حالات میں جو آدمی بستر کی موت مرے گا، وہ اپنے رب کی معرفت پر ہوگا۔ رسولؐ اور آلِ رسولؐ کے حق کی معرفت پر ہوگا۔ اس کی یہ موت شہادت ہوگی، اس کا اجر اللہ پر ہوگا، اپنے صالح اعمال کی جزا پائے گا۔ الخ

⑦ مفضل بن یزید سے روایت ہے حضرت امام صادق علیہ السلام نے فرمایا: اے مفضل! جس نے سلطان جائر پر خروج کیا اور اُسے مصیبت پہنچی تو وہ اس مصیبت پر اجر سے خالی رہے گا، اُسے صبر والا رزق نہیں ملے گا۔ (الوسائل، باب ۲)

اس حدیث کی تشریح میں ہم عرض کریں گے: اوّلاً یہ ہے کہ سلطان جائر سے لڑنے میں کوئی شرعی سقم نہیں ہے بلکہ اُسے جو مصائب پیش آئیں گے ان مصائب

کے جھیلنے پر وہ ثواب سے محروم رہے گا کیونکہ اُس کا وظیفہ صبر تھا اُس نے صبر نہیں کیا۔

ثانیاً: سلاطین ظلم و جور کے خلاف خروج کو مطلقاً حرام قرار دینا ضرورت کے خلاف ہے۔ ہاں کبھی کبھی تقیہ کے احکام نافذ ہوجاتے ہیں۔ ہاں اگر اس روایت کو صحیح تسلیم کرلیا جائے تو اس سے مراد یہ ہو کہ بغیر سوچے سمجھے خروج نہیں کرنا چاہیے صاحبانِ رائے کی رائے بھی شرط ہے۔

⑧ مفضل بن صالح نے جناب جابرؓ سے اُس نے حضرت امام باقر علیہ السلام سے سنا، آپؑ نے فرمایا: لوگوں پر ایک وقت آئے گا، ان کا امام غیبت میں ہوگا۔ اس زمانے کے ان لوگوں کے لیے خوشحالی ہے، جو ہمارے امر کی اطاعت کرنے والے ہوں گے۔ اس وقت جابرؓ نے سوال کیا: اے فرزندِ رسولؐ! اس زمانے کے مومن کو کیا کرنا چاہیے؟

آپؑ نے فرمایا: اپنی زبان کی حفاظت کرے اور اپنے گھر میں ساکن رہے۔

(بحار، ج ۵۲، ص ۱۴۵ و کمال الدین، ص ۳۳۰)

یہ روایت اپنی سند کے لحاظ سے ضعیف ہے۔ جب سے زمانِ غیبت شروع ہوا تو شیعیان اہلِ بیتؑ کے مصائب میں اضافہ ہوا کیونکہ ان کے امام پردۂ غیب میں تشریف لے گئے۔ تو اس زمان میں ضروری ہوگیا کہ وہ اپنے امور میں اعادہ نظر کریں اور اپنے اعداء کی سازشوں سے بچنے کے لیے تقیہ کو اپنائیں اور حکم دیا گیا کہ اپنی زبان کی حفاظت کریں۔ یہ اس لیے کہا گیا کہ وہ دور بڑا سخت ہوگا، جب ایک اہلِ ایمان خاموشی سے زندگی بسر کرے گا تو امان میں رہے گا۔ اگر زبان کھولے گا تو اپنی مشکلات میں اضافہ کرے گا۔

اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ امام علیہ السلام کی غیبت کا زمانہ کئی ایک مشکلات کا زمانہ ہوگا۔ شکوک و شبہات جنم لیں گے۔ لوگوں کے نفوس معنوی طور پر ضعیف

ہو جائیں گے۔ ان کی معرفت میں فقدان پیدا ہوگا۔ اس دور میں حق پر قائم رہنا یہ ایک عظیم الشان عمل ہوگا۔ اس سے بڑا عمل اور کوئی نہ ہوگا۔

⑨ حضرت امام صادق علیہ السلام نے فرمایا: اے سُدیر! اپنے گھر کو لازم کرو اور خاموشی کے ساتھ رہو۔ رات اور دن کی طرح سکون پذیر رہو۔ جب تمہیں سفیانی کی خبر ملے تو فوراً ہماری طرف دوڑ کر آنا۔ (الکافی، ص ۲۲۰)

اس حدیث کی مثل وہ حدیث بھی ہے جو حضرت امام باقر علیہ السلام نے جناب جابرؓ سے فرمائی تھی۔ (الوسائل، ج ۱۵، ص ۵۶، باب ۱۳، الغیبۃ النعمانی، ص ۱۴۹)

اب ان احادیث کے ضمن میں ہم یہ کہیں گے:

❶ پہلی بات تو یہ ہے امامؑ نے سفیانی کی جو آیت بیان فرمائی تو اس کے ذریعے معلوم ہو جائے گا کہ امامِ حق نے ظہور فرمایا ہے، اسی طرح کی علامات امام باقر علیہ السلام نے جناب جابرؓ سے بیان فرمائیں۔

تو ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ امام علیہ السلام نے حتمی علامات بیان فرمائیں جن کے ذریعے امامِ حق کو پہچانا جاسکتا ہے اور جھوٹے مدعیان کو رد کیا جاسکتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ سُدیر والی حدیث سے یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ یہ صرف حکم سُدیر کے لیے ہو کہ وہ اپنے گھر میں سکون پذیر رہے، اس لیے آپؑ نے سُدیر سے فرمایا: عَصِیدَۃٌ بِکُلِّ لَوْنٍ (تنقیح المقال، ج ۲، ص ۸) کیونکہ سُدیر ماحول سے متاثر ہو چکا تھا وہ حقائق کو جانے بغیر انقلاب کی تلاش میں تھا۔

⑩ فضل کاتب راوی ہے۔ اُس نے کہا: جب ابو مسلم خراسانی کا خط حضرت امام صادق علیہ السلام کے سامنے آیا تو آپؑ نے فرمایا: تیرے خط کا کوئی جواب نہیں ہے۔ ہم سے دُور چلا جا۔ آپؑ نے یہ بھی فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اپنے ذکر کو بلند کیا ہے۔ وہ اپنے بندگان کی عجلت کو دیکھ کر کسی امر میں جلدی نہیں فرماتا۔ ایک پہاڑ تو اپنے مقام

سے ہٹ سکتا ہے لیکن کسی کی حکومت جب تک اس کی مدت پوری نہ ہو، ختم نہیں ہوسکتی۔ پھر آپؑ نے فرمایا: فلاں بن فلاں نے حکومت کرنی ہے۔ اس طرح آپؑ نے سات آدمیوں کے نام شمار کیے کہ فلاں کے فلاں بیٹوں نے حکومت کرنی ہے۔

راوی کہتا ہے کہ اُس وقت میں نے عرض کیا: قربان جاؤں آپؑ کے اور ہمارے درمیان کیا علامت ہوگی؟

معصومؑ نے فرمایا: اے مفضل! سکون سے رہو، جب تک سفیانی کا خروج نہیں ہوتا۔ جب سفیانی خروج کرے تو فوراً ہماری آواز پر لبیک کہو۔

یہ حدیث کہ پہاڑ کا اپنی جگہ سے ہلنا آسان ہے اور اس سلطنت کا اپنی مدت پورا کیے بغیر خاتمہ ہونا مشکل ہے۔ پیغمبرؐ سے بھی مروی ہے۔ اب مختصر صورت میں اس حدیث کے بارے کچھ عرض کرتے ہیں:

❶ اس حدیث کی سند کے صحیح ہونے یا ضعیف ہونے کو ایک طرف رکھتے ہوئے اس حدیث کا مفاد اس صورت میں سامنے آتا ہے کہ امام علیہ السلام اپنے پیروکاروں سے یہ مطالبہ کر رہے تھے کہ وہ انتقام کے لیے اُٹھیں لیکن آپ ابومسلم خراسانی کے انقلاب سے منع کر رہے تھے اس لیے جب فضل نے علامت کے بارے بات کی تو آپؑ نے خروج سفیانی کو علامت ٹھہرایا۔ اس بیان کا مقصد یہ ہے کہ امام علیہ السلام اپنی حکومت چاہتے تھے لیکن آپؑ نے فرمایا: ہماری حکومت اس وقت تک نہیں بن سکتی جب تک امام مہدی علیہ السلام ظہور نہیں فرماتے۔

اس لیے آپؑ نے فرمایا: کسی کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ ہم میں سے جب کوئی خروج کرے اور وہ اس کے پیچھے دوڑ پڑے کیونکہ وہ شخص ہم اہلِ بیتؑ میں سے تو ضرور ہے لیکن امام مہدی نہیں ہے، اس لیے اپنے دعویٰ مہدویت میں صادق نہیں ہے۔

❷ اس روایت سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ امام علیہ السلام نے ابومسلم کو تحریک

نہیں کیا تھا اور نہ اُنھیں جنھوں نے اُسے آپؑ کی طرف بھیجا تھا۔ ابو مسلم آپؑ سے اس امر میں نصرت چاہتا تھا تاکہ آپؑ کے پیروکار استفادہ کریں۔ کیونکہ اُموی حکومت کے سقوط کے بعد حالات بدل گئے تھے۔

ایک اور روایت اس امر کی وضاحت کرتی ہے۔ امام علیہ السلام کے پاس ایک خط آیا۔ یہ اس وقت کی بات ہے کہ ابھی تک عباس کی اولاد کے پاس حکومت نہیں آئی تھی۔ معلی بن خنیس حضرت امام صادق علیہ السلام کے پاس آئے، ان کے پاس عبدالسلام بن نعیم اور سدیر وغیرہ کا خط تھا، اس خط کی عبارت یہ تھی: ''ہم سب نے اقرار وعہد کیا ہے کہ اس امر کو آپؑ کے حوالے کردیں، آپؑ کی کیا رائے ہے؟ راوی کہتا ہے: امامؑ نے وہ خط زمین پر پھینک دیا اور فرمایا: افسوس ہے، افسوس ہے، میں وہ امام نہیں ہوں وہ امامؑ جس کے پاس حکومت آئے گی۔ وہ ہے، جو سفیانی کو قتل کریں گے۔ (وسائل، ج ۱۵، ص ۵۲، ۵۳، باب ۱۳، رجال کشی، ص ۳۵۳، تنقیح المقال، ج ۲، ص ۱۵۲، الکافی، ص ۲۷۴)

ابوبکر حضرمی سے روایت ہے کہ میں اور ابان علی بن عبداللہ کے حضور حاضر ہوئے۔ اُس وقت خراسان سے سیاہ علَم ظاہر ہو چکے تھے۔ ہم نے عرض کیا: ان کے بارے میں آپ کیا فرمائیں گے؟

آپؑ نے فرمایا: اپنے گھر میں بیٹھے رہو، جب ہمیں کسی آدمی پر اجتماع کرتے ہوئے پاؤ تو مسلح ہو کر آجاؤ۔ (غیبۃ النعمانی، ص ۱۹۷)

عمر بن حنظلہ روایت کرتے ہیں: میں نے حضرت امام صادق علیہ السلام سے سنا، آپؑ نے فرمایا: قیام قائمؑ سے قبل پانچ علامات ظاہر ہوں گی: پہلی: ان میں سے ایک آسمانی چیخ ہوگی، دوسری: سفیانی کا خروج اور تیسری: نفسِ ذکیہ کا قتل، چوتھی: لشکر کا زمین میں دھنس جانا اور پانچویں یمانی کا خروج۔

اس وقت میں نے عرض کیا: میں آپؑ پر قربان جاؤں اگر ان علامات کے

ظہور سے قبل آپؑ کے اہلِ بیتؑ میں سے کوئی فرد خروج کرے کیا میں اس کا ساتھ دوں؟

آپؑ نے فرمایا: نہیں۔ (وسائل، ج ۱۱، ص ۳۷، باب ۱۳، الکافی، ص ۲۵۸)

اب اس روایت کا تجزیہ پیش کرتے ہوئے یہ کہیں گے:

اس امر کی پہلی بات تو یہ ہے کہ عمر بن حنظلہ کی روایت اپنی سند کے لحاظ سے تام ہے، لیکن اس روایت کا ظاہر اور اس سے قبل والی روایات کا ظاہر یہ ہے کہ اہلِ بیتؑ کے جو لوگ ان علامات سے قبل خروج کر رہے ہیں، حقیقی مہدی نہیں ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ وہ سب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خاندان کے لوگ ہیں، اس لیے معصوم کے حضور میں عمر بن حنظلہ نے اپنے سوال کو اس جملہ سے مقید کر دیا: ''اگر کوئی آپؑ کے اہلِ بیتؑ سے خروج کرے......الخ''۔

مزید وضاحت کے لیے یہ عرض کریں گے: عمر بن حنظلہ کا سوال اس وقت ہوا جب امامؑ ظہورِ مہدیؑ کی علامات بتا چکے تھے۔ عمر بن حنظلہ امامؑ کے اقوالِ سابقہ کی امامؑ سے تاکید چاہتا تھا اور ان اقوال کا خلاصہ یہ تھا۔ ان علامات سے قبل اگر کوئی خروج کرے تو وہ مہدی موعود نہیں ہوگا، چہ جائیکہ خروج کرنے والا اہلِ بیتؑ کا فرد ہی کیوں نہ ہو۔

اب دوسری بات: یہ تمام روایات یہ بتاتی ہیں کہ اُس زمانے کے کچھ شیعہ حضرات بنو عباس کے دھوکے میں آ گئے تھے۔ انھوں نے یہ سمجھا تھا کہ یہ لوگ حق پر ہیں۔ آخرکار یہ لوگ حکومت امام کے حوالے کر دیں گے۔ اس لیے امامؑ نے اپنے پیروکاروں کو سختی کے ساتھ روک دیا تھا کہ وہ ان سے رابطہ نہ رکھیں۔ یہ وہ نہیں ہیں۔ امام مہدیؑ وہ ہیں جن کے لیے علامات مقرر ہیں اور وہ اہلِ بیتؑ سے ہیں۔ اُنھیں حکومت ملے گی۔ اُن کے ظہور کی علامات میں سے سفیانی کا خروج ہے۔ لشکر کا زمین میں دھنس جانا ہے۔ آسمانی ندا ہے وغیرہ

اس کے بعد امامؑ نے اپنے ماننے والوں کو حکم دیا کہ وہ ان لوگوں کے پیچھے نہ چلیں، یہ اپنے دعویٰ میں صادق نہیں ہیں۔

⑪ ان روایات سے یہ استدلال کیا جاسکتا ہے: جہاد اگر ہے تو وہ صرف امامِ عادل کی قیادت میں ہے، اس کے علاوہ کوئی جہاد جہاد نہیں ہے۔ (وسائل، باب ۳۲)

پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ روایات سند کے لحاظ سے ضعیف ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ امام عادل کی بات کی گئی ہے، یا اس کی بات کی گئی ہے، جس کی اطاعت فرض ہو تو ان روایات میں "امام عادل" کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ یعنی وہ شخصیت جس پر امام عادل کا اطلاق ہو۔ یہاں امام عادل سے معصوم مراد نہیں ہے۔

تیسری بات یہ کہ یہ روایات اس امر کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ جو بغیر حق کے خروج کر رہے ہیں، ان کی نصرت مت کرو۔

⑫ اس مضمون کی روایت جس کے راوی حسین بن خالد ہیں، موجود ہے۔ اُس نے کہا کہ حضرت امام رضا علیہ السلام کا فرمان ہے: "جس نے ہمارے قائمؑ کے ظہور سے قبل تقیہ چھوڑا وہ ہم سے نہیں ہے"۔ (وسائل، باب ۳۲)

اس روایت کے ضمن میں ہم یہ کہیں گے کہ یہ روایت بھی اپنی سند کے لحاظ سے ضعیف ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ حضرت امام مہدی علیہ السلام کے ظہور سے قبل تقیہ مرتفع نہیں ہوگا بلکہ بہت سے اُمور میں باقی رہے گا۔

آخر میں یہ کہیں گے دین اسلام صرف شعائر اور توجیہات روحی و اخلاقی کا دین نہیں ہے بلکہ یہ الٰہی دین ہے۔ یہ شریعتِ ربانی ہے۔ اس کے اپنے احکام وضوابط ہیں۔ اس میں سیاسیات میں حدود وتعزیرات ہیں۔ دین اسلام قاتل کو قتل کرنے کا حکم دیتا ہے اور زانی کے لیے رجم اور کوڑوں کا حکم دیتا ہے۔ چور کے ہاتھ کاٹنے کی سفارش

کرتا ہے جو قید و تعزیر کا حق دار ہے اُسے قید کرتا ہے اور اس پر تعزیر لگاتا ہے اور جس کے لیے جلاوطنی کا حکم ہے اُسے جلاوطن کرتا ہے، وغیرہ وغیرہ۔

اسی دین اسلام میں امر بالمعروف بھی ہے اور نہی عن المنکر بھی ہے۔ کبھی قلب کے ساتھ اور کبھی زبان کے ساتھ اور کبھی ہاتھ کے ساتھ اس میں ظالم کا انکار بھی ہے۔ یہ دین اسلام ترغیب دیتا ہے کہ سلطان جائر کو کلمہ حق کہہ دو اور اسلام کی سربلندی کی خاطر جہاد بھی کرو اور اہلِ اسلام کی حفاظت بھی کرو۔

اسی دین اسلام میں قضاوت بھی ہے۔ اسی اسلام میں یہ حکم بھی موجود ہے کہ باغی گروہ سے قتال کرو یہاں تک کہ وہ اللہ کے امر کی طرف لوٹ آئیں۔ دین اسلام میراث کی بھی تشریح کرتا ہے اور اسی طرح معاملات و تجارت کی بھی توضیح فرماتا ہے۔ دین اسلام نے وہ نظامِ حیات پیش کیا ہے جو پوری انسانیت کے مصالح کی بات کرتا ہے۔

اس امر میں کوئی شک نہیں ہے کہ دین اسلام کے احکام کی ترویج کے لیے حکومت کا ہونا ایک لازمی امر ہے، جس کے ذریعے اس کے احکام کی اقامت ممکن ہے۔ اگر اسلام کے پاس حکومت نہ ہو تو اُس کے احکام کا نفاذ ممکن ہی نہیں ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْهِ (الشوریٰ:۱۳)

”دین (اسلام) کو قائم کرو اور اس میں فرقہ بندی نہ کرو“۔

حکومت کے ذریعے ہی دین اسلام کے احکام کا نفاذ ہے۔ اس کے علاوہ نفاذِ شریعت ناممکن ہے۔

O......OOO......O

تیسرا حصّہ

موقف وعقیدت

مجتہد

سوال قابلِ صد احترام! آپ السید محمد حسین فضل اللہ کے اجتہاد کے بارے میں کیا فرمائیں گے؟ کیا وہ مجتہد ہیں یا نہیں ہیں؟ آپ دلیل کے ساتھ ثابت فرمائیں۔

جواب السید محمد حسین فضل اللہ کا مسئلہ اجتہاد ایک مشکل مسئلہ ہے۔ آیا وہ مجتہد ہیں یا نہیں ہیں۔ ان کے ساتھ جو اختلاف ہے، وہ عقائد کا اختلاف ہے۔ پہلے تو اس مسئلہ کو حل کرنا چاہیے پھر دوسرے مسائل بھی ہیں، جن میں وہ ہم سے اختلاف رکھتے ہیں۔

میرے محترم بھائی! یہ میں نہیں چاہتا کہ میں ان کے بارے کچھ کہوں، ان کے اجتہاد کے بارے میں علمائے اسلام اور آیاتِ عظام نے فیصلہ دے رکھا ہے۔ ان آیاتِ عظام میں الشیخ جواد تبریزی ہیں، السید کاظم حائری ہیں، شہید محمد الصدر قدس سرہ ہیں۔ اس طرح شیخ نور ہمدانی نے ان کے اجتہاد کو مشکوک قرار دیا۔ السید مددی قبلہ نے بھی شیخ نوری ہمدانی قبلہ کی تائید کی ہے۔ اس طرح قم المقدسہ کے آیاتِ عظام ہوں یا ان کے علاوہ آیاتِ عظام، ان سب نے یہی فیصلہ دیا ہے کہ وہ مجتہد نہیں ہیں۔

ان حضرات کی بات ایک فیصلہ کن بات ہوتی ہے کیونکہ یہ حضرات اس امر میں تمام لوگوں سے زیادہ عارف ہیں اور صاحبانِ تقویٰ ہیں اور امام زمانؑ کے نائب ہیں۔

جی ہاں! میں یہ بھی کہوں گا، جو آدمی اجتہاد کا دعویٰ کرتا ہے تو وہ اپنے اجتہاد کو دلیل کے ساتھ ثابت کرتا ہے۔ اگر وہ کوئی دلیل نہیں رکھتا تو پھر اگر مراجع عظام میں سے کوئی مرجع شہادت دے دے تو اس ایک مرجع کی شہادت اس کے اجتہاد میں کفایت کرتی ہے۔

اگر اس کے پاس یہ صورت نہ ہو تو پھر سوالات کے ذریعے ان کی علمی شخصیت کو اور ان کے استنباط کو پرکھا اور جانچا جا سکتا ہے۔ آیا وہ مجتہد ہے یا نہیں ہے اور یہ علمی دنیا کی بات ہے۔ اس میدان میں مَیں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا۔

جی ہاں! السید فضل اللہ صاحب نے کئی مرتبہ اعلان فرمایا کہ ان کی کتب اور فقہی تالیفات اس امر کی شاہد ہیں کہ وہ مجتہد ہیں لیکن مراجع اُمت نے کوئی ایسا حکم صادر نہیں فرمایا جس سے ان کا اجتہاد ثابت ہو۔ انھوں نے واضح طور پر فرمایا ہے کہ وہ مجتہد نہیں ہیں۔

اب اگر کوئی فرد ان کی کتب کو دیکھ کر کہے کہ وہ مجتہد تھے تو میں اس کی خدمت میں عرض کروں گا کیا اس کے لیے مراجع عظام کا فیصلہ کافی نہیں ہے۔ جب اُس کے لیے علمائے اسلام اور آیاتِ عظام کا فیصلہ کافی نہیں تو پھر میری شہادت اس کے لیے کیسے کافی ہوگی۔ خداوند تعالیٰ ہمیں اور آپ کو اپنی رضا کے حصول کی توفیق مرحمت فرمائے۔

اِدۡفَعۡ بِالَّتِیۡ ہِیَ اَحۡسَنُ

سوال میں آپ کو اور آپ ایسے لوگوں کو ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ آیت اللہ العظمیٰ السید محمد حسین فضل اللہ بیسویں اور اکیسویں صدی کی ایک عظیم الشان علمی شخصیت ہیں۔ خداوند تعالیٰ ان کی محافظت فرمائے تاکہ ہم ان کے علم سے استفادہ کرسکیں

اور تم ایسے لوگوں سے ہمیں اور باقی لوگوں کو محفوظ رکھے۔

آیت اللہ العظمیٰ فضل اسلام کے خزانہ ہیں، ہم ان پر جتنا فخر کریں، کم ہے۔ تم ایسے لوگوں کی تھوتھنیوں کو لگام دی جائے تا کہ وہ اسلام کی خدمت کر سکیں۔ آپ کی کتابوں نے اسلام اور شیعیانِ حیدر کرارؑ کو فائدہ دینے کے بجائے ان کے اعداء کو تقویت دی ہے۔

کیا آپ لوگ یہی سمجھے ہوئے ہیں کہ جو کچھ تم آیت اللہ فضل اللہ کے خلاف لکھتے جاؤ گے، لوگ تسلیم کرتے جائیں گے۔ آپ لوگوں کو یہ بتا رہے ہیں کہ آیت اللہ دھوکہ باز اور مرجع سُو ہیں۔

میں دوبارہ یہ کہوں گا، آپ نے جتنا آیت اللہ فضل اللہ کے خلاف لکھا ہے تو اس کے پڑھنے کے ساتھ میرے دل میں ان کا احترام بڑھا ہے۔ میں ان کو عقیدت کی نظر سے دیکھتا ہوں۔

میں نے آپ کی گفتگو اور ان کی گفتگو کا تقابلی جائزہ لیا ہے۔ اس جائزے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں، وہ حق پر ہیں اور ان کا مخالف باطل پر ہے۔

آیت اللہ العظمیٰ السید محمد حسین فضل اللہ حق پر ہیں۔ آپ کی گفتگو نہایت کمزور ہے اور ننگ و عار ہے اور آپ بھی ہر مسلم کے لیے ننگ و عار ہیں۔

جواب اما بعد! میں نے تشکر و احسان کے ساتھ آپ کے خط کا مطالعہ کیا۔ آپ نے اپنی دینی غیرت کا اظہار فرمایا ہے اور جو کچھ آپ کے سینے میں تھا وہ بیان فرمایا۔ آپ نے جس شدید ترین موقف کا دفاع کیا ہے، میں اللہ تعالیٰ کے حضور دعا

مانگتا ہوں اُسے آپ کے نامۂ اعمال میں جگہ عنایت کرے۔ اعمال کا دارومدار نیت پر ہوتا ہے۔ میں تو صرف حضرت امام علی علیہ السلام اور اہلِ بیت عظام کے موالیوں میں اس جرأت اور محبت کو زندہ کرنے کی کوشش میں ہوں۔

میں اللہ تعالیٰ سے سوال کرتا ہوں کہ وہ ہمیں اور آپ کو حوضِ کوثر پر امیر المومنینؑ کے پاس جمع کرے اور وہ ہمیں اپنے یدِ مبارک سے حوضِ کوثر پلائیں اور ہماری شفاعت فرمائیں اور ہمارا حشر ان کے ساتھ ہو۔

میرے برادر محترم! آپ کبھی یہ گمان نہ کریں کہ جس گفتگو سے آپ نے مجھے مخاطب کیا اس گفتگو نے مجھے پریشان کر دیا ہوگا۔ نہیں بالکل نہیں۔ اس سے قبل کہ آپ مجھ سے معذرت کریں میں نے آپ کو معاف کر دیا ہے۔ مجھے یہ معلوم ہے آپ میرے اور السید فضل اللہ کے اختلافات سے واقف ہیں اور آپ نے یقین کی حد پر جا کر کہہ دیا کہ وہ حق پر ہیں اور باقی مراجع عظام اپنے موقف میں خطا پر ہیں۔ آپ نے فیصلہ دے دیا کہ آیاتِ عظام اور علمائے اسلام اُمت سب خطا پر ہیں۔ میں کہتا ہوں آپ نے مبالغہ سے کام لیا۔

ہمارے مراجع عظام سب ثقہ اُمت ہیں، متقی اور ابرار ہیں۔ اس زمانے کے محققین ہیں۔ آپ جیسا آدمی ان پر یہ حکم لگائے عجیب ہے۔

میرے برادر محترم! شاید میری باتیں آپ پر گراں گزری ہوں گی، میں آپ سے اُمید رکھتا ہوں۔ آپ معاف فرمائیں گے میں نے یہ پسند کیا کہ میں آپ پر آپ کا سلام لوٹا دوں۔ آپ نے میرے ساتھ یہ خط و کتابت کی ہے تو اللہ تعالیٰ آپ کی اس سعی کو قبول فرمائے، آپ کی محافظت فرمائے۔ ہمیں اور تمہیں حضرت زہراؑ اور ان کے والد بزرگوار اور ان کے شوہرِ نامدار اور ان کی اولادِ ابرار کی شفاعت نصیب فرمائے۔

آپ پر اور آپ جن کو چاہتے ہیں خداوند تعالیٰ کی سلامتی کا نزول ہو۔

موسیقی، طبل و دف

سوال میں ایک جوان لڑکی ہوں اور اپنے اس مسئلہ میں حیران و پریشان ہوں۔ میں آپ کی ذات والاصفات سے اُمید رکھتی ہوں آپ میری اس مسئلہ میں رہنمائی فرمائیں گے۔

کیا دف یا طبل جو شادی کی محفلوں میں بجائے جاتے ہیں حرام ہیں؟ کیا عورت کا رقص عورت کے لیے جائز ہے؟

جواب امابعد! اے میری بہن! آپ اپنے مرجع تقلید سے رابطہ کریں۔ اس مسئلہ کا جواب وہ دیں گے۔ ہاں اگر آپ ایک شخصی رائے پوچھنا چاہتی ہیں تو اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ تکلیف شرعی عمل کا تقاضا کرتی ہے اور وہ عمل مرجع کے فتویٰ کے ساتھ مربوط ہے۔

رؤیت ہلال

سوال "رؤیت ہلال" کے بارے میں آپ کی رائے چاہتا ہوں اُمید ہے جناب اپنی آراء سے مستفید فرمائیں گے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا آیا ہے رمضان المبارک کا چاند بعض علما اور ان کے مقلدین کے لیے ثابت ہو جاتا ہے اور بعض کے لیے ثابت نہیں ہوتا۔ کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ اس مسئلہ میں تمام شیعیانِ اہلِ بیتؑ کا اتفاق ہو جائے اور اختلاف ختم ہو جائے اور اسی طرح ماہ شوال کے چاند کا مسئلہ بھی اتفاقی صورت میں حل ہو جائے؟

کیا اس امر میں اجتہاد ہوسکتا ہے تاکہ تمام شیعیانِ اہلِ بیتؑ ان امور میں ایک نظر آئیں۔ ہماری تمنا ہے کہ یہ اختلاف ختم ہو جائے۔

اس موضوع کی مثال آپ کے سامنے رکھوں۔ اس سال کویت
میں ہماری ایک جماعت عید منا رہی تھی اور دوسری جماعت روزہ
کے ساتھ تھی۔ میری خواہش ہے کہ آنے والی عید اُمت مسلمہ
اکٹھی منائے۔

جواب اما بعد! رویت ہلال کا مسئلہ مراجع عظام سے مربوط ہے کیونکہ وہ ہلال کے احکام کا استنباط کرتے ہیں لیکن اس مسئلہ میں اُفق کی ایک بنیادی حیثیت ہے۔ جس طرح دوسرے مسائل میں مقلدین اپنے اپنے مراجع کی تقلید کرتے ہیں۔ اس طرح اس مسئلہ میں بھی وہ اپنے مرجع کے مقلد ہوتے ہیں۔

ہلال کا مسئلہ رویت کے تابع ہے اور اس رویت کو دلیل شرعی سے ثابت کرنا ضروری ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ ایک جماعت رویت ہلال کا دعویٰ کرتی ہے۔ بعض لوگ ان کی رویت اور شہادت پر یقین رکھتے ہیں۔ دوسرے کچھ اور لوگ ہوتے ہیں جو ان کو ثقہ نہیں سمجھتے یا وہ ان لوگوں کی وثاقت سے متعارف نہیں ہوتے۔ اب اس دوسری صورت والے لوگوں کے لیے جائز نہیں ہے کہ ان کے اقوال پر عمل کریں۔

یہی وجوہات ہیں جن کی بنا پر عید کے دن کے تعین میں اختلاف ہو جاتا ہے۔ یہ وہ اختلاف نہیں ہے، جو نقصان دے بلکہ ایک انسان پر واجب ہے کہ وہ حکم شرعی کی اتباع کرے۔ اگرچہ اس کی خواہش کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ ہم پر یہ بھی واجب ہے کہ ہم پوری تحقیق سے کام لیں تاکہ تکلیف شرعی پر عمل ہوسکے۔ اور یہی علامت سلامتی کی علامت ہے نہ کہ مرض کی۔ جو مریض ہوتا ہے وہ دین میں سُستی اپناتا ہے اور تکالیف شرعی سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا ہے اور ان اُمور کو اپنانے کی کوشش کرتا ہے، جو دین میں فائدہ دینے والے نہیں ہوتے، جس کی وجہ سے وہ اُلجھ کر رہ جاتا ہے۔ خداوند تعالیٰ آپ کو امور دینیہ کے حصول میں کامیابی عطا فرمائے۔

اہلِ سنت کا تشہد

سوال میں نے اہلِ سنت کے تشہد میں خوب نظر کی ہے، ان کی کتب کا بھی مطالعہ کیا ہے جیسا کہ الجامع الصغیر اور معجم طبرانی۔ میں تو اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ان لوگوں نے ہمارے تشہد کو معلب کر کے اپنا تشہد بنا لیا ہے۔ وہ اپنے تشہد کی ابتدا تسلیم سے کرتے ہیں۔ پھر تشہد پڑھتے ہیں اور اپنے تشہد کی سند روایات سے مربوط کرتے ہیں۔ اپنی ان روایات کا مرجع ابن مسعود کو بھی ٹھہراتے ہیں۔

① ان روایات کے بارے آپ کیا فرمائیں گے؟
② کیا اس تشہد سے ان کی نماز باطل ہو جاتی ہے؟
③ کیا یہ صحیح ہے کہ "دوسرے" نے اس میں تبدیلی پیدا کی؟

جواب اما بعد! ہر مذہب کے کچھ اصول و ضوابط ہوتے ہیں۔ یہی اصول و ضوابط ان کے فقہی مصادر ہوتے ہیں اور پھر انھی سے وہ نتائج اخذ کرتے ہیں۔ ایسے امور میں بحث کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ کیونکہ ایسی بحثیں حق تک نہیں پہنچاتیں۔ اصل بات یہ ہے کہ بحث کی جائے ان اُمور میں جو اساسی ہیں، تب جا کر ایک انسان حق تک جا پہنچتا ہے۔ اسی موضوع کو جب امامت سے مربوط کیا جائے اور بالخصوص حدیث ثقلین سے تو معاملہ حل ہو سکتا ہے۔

O......OOO......O

چوتھا حصّہ

متفرقات

روایت اور درایت

سوال حَدِيثٌ تَدْرِيهِ خَيْرٌ مِنْ أَلْفِ تَرْوِيه "ایک حدیث درایت کے ساتھ ہزار روایت سے بہتر ہے"۔

میں معذرت پیش کروں گا کیونکہ میں آپ پر بہت زیادہ سوالات کرتا رہتا ہوں۔ مجھے امید ہے آپ معاف فرمائیں گے لیکن ان مسائل سے میری غرض عوام الناس سے مربوط ہوتی ہے۔ آپ کی شخصیت سے جو جوابات ملتے ہیں ان میں کئی ایک علمی نکات ہوتے ہیں:

① معصومین علیہم السلام سے کئی ایک اقوال موجود ہیں جیسا کہ ان کا فرمان ہے:

حَدِيثٌ تَدْرِيهِ خَيْرٌ مِنْ أَلْفِ تَرْوِيه

ولا يكون رجل منكم فقيها حتّى يعرف معاريض كلامنا وان الكلمة من كلامنا لتنصرف على سبعين وجة لنا من جميعها فخرج

وانتم افقه الناس اذا عرفتم معانى كلامنا ان الكلمة لتصرف على وجوه فلوشا انسان يصرف كلامه كيف

شاء ولا یکذب

اس طرح کی اور روایات بھی ہیں۔ ان روایات کے بطون میں
اور اس طرح وہ تعداد میں ستر بطون بنتے ہیں؟ اگر ایسا ہے تو پھر
ہمارے لیے تاویل کا باب کھل جائے گا۔ اسی بات کی طرف تو
احمد بن زید الدین احسائی گئے ہیں۔

یا اس سے مراد یہ ہے کہ ان کے کلام کے ستر چہرے ہیں تو پھر
بیان حکم سے توریت کا سہارا لیا گیا ہے۔ آخر یہ کس لیے؟

کیا لفظ "شئ" کا اللہ تعالیٰ کی ذات پر اطلاق ہو سکتا ہے؟ کیا
اس مضمون کی روایات اہلِ بیتؑ سے جاری ہوئی ہیں؟

جواب امابعد! پہلے سوال کا جواب تین احادیث پر مشتمل ہے۔ اس میں سند اور دلالت کی بحث کی ضرورت نہیں۔

پہلی حدیث: حَدِیۡثٌ تَدۡرِیۡہِ خَیۡرٌ مِنۡ اَلۡفِ تَرۡوِیۡہٖ۔ یہ اُس فرد کے بارے میں کہا گیا ہے جو احادیث کا اہتمام تو کثرت کے ساتھ کرتا ہے لیکن معانی کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔

جب ہم اس حدیث میں غور کرتے ہیں تو یہ سمجھ میں آتا ہے کہ کبھی تو اس حدیث کو مستقل طور پر بیان کیا گیا ہے اور کبھی دوسری حدیث تک پہنچنے کے لیے بیان کیا گیا ہے۔ وہ دوسری حدیث یہ ہے:

ولا یکون رجل منکم فقیھا ، حتٰی یعرف ......الخ

اب ہم اپنے موضوع کی طرف آنا چاہتے ہیں۔ ہمیں یہاں کوئی اور غرض نہیں ہے۔ درج ذیل احادیث کی روشنی میں اس مسئلہ کو حل کرتے ہیں:

① حضرت امام رضاؑ کا فرمان ہے:

"ہماری احادیث میں کچھ ایسی احادیث بھی ہیں، جو قرآن مجید
کی طرح متشابہ ہیں اور کچھ اس طرح محکم ہیں، جس طرح قرآن
مجید کی آیات محکم ہیں۔ تو متشابہ کو محکم کی طرف لوٹا دو، محکم کے
بغیر متشابہ پر عمل نہ کرو ورنہ گمراہ ہو جاؤ گے"۔ (بحار، ج ۲، ص ۱۸۵)

ایک دوسری نص بھی ہے: ہماری احادیث میں کچھ قرآن کے متشابہ کی طرح متشابہ ہیں اور کچھ محکم ہیں جس طرح قرآن کی آیات محکم ہیں پس متشابہ کو رد کر دو۔ (بحار، ج ۲، ص ۱۸۵)

علامہ مجلسی نے فرمایا: امام علیہ السلام کا فرمان "دون محکمھا" کا مطلب یہ ہے کہ اس پر عمل کرو اور متشابہ کو ہماری طرف رہنے دو۔ اس میں فکر مت کرو، محکم میں فکر کرو اور اس پر عمل کرو۔ (بحار، ج ۲، ص ۱۸۵)

۲ محمد بن اسماعیل نے علی بن نعمان سے، اس نے ابن مسکان سے، اس نے عبدالاعلیٰ بن اعین سے سنا، اس نے کہا: میں اور علی بن حنظلہ حضرت امام صادق علیہ السلام کے حضور آئے۔ علی بن حنظلہ نے مسئلہ پوچھا۔ آپؑ نے جواب دیا تو علی نے عرض کیا: اگر وہ ایسا اور ایسا ہو تو آپؑ نے اس کا دوسرا جواب دیا۔ علی نے کہا: اگر وہ اس طرح کا ہو تو آپ نے تیسری صورت میں جواب دیا۔ یہاں تک کہ معصوم نے چار صورتیں بیان فرمائیں۔ پھر علی بن حنظلہ میری طرف متوجہ ہوا اور کہا: اے ابو محمد! انھوں نے ہمیں احکام بتائے ہیں۔ تو اس وقت معصومؑ نے سن لیا اور فرمایا: اے ابوالحسن! ایسی بات مت کرو۔ آپ تو ایک پرہیزگار شخص ہیں۔ کچھ ایسے امور ہیں، جن کا وقت تنگ ہے جس کو ایک صورت میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ انھی امور میں سے جمعہ کا وقت ہے۔ اس کا وقت صرف اور صرف زوال شمس ہے۔ کچھ امور وہ ہیں، جن کا وقت وسیع ہے۔ ان کی صورتیں کثرت کے ساتھ ہیں۔ اللہ کی قسم! میرے نزدیک ان کے ستر چہرے

ہیں۔ (بحار، ج ۲، ص ۱۹۷)

علامہ مجلسی نے فرمایا: شاید کہ جمعہ کے وقت کو حدیث میں بطور تمثیل بیان کیا گیا ہے اور اس بیان کی غرض یہ ہے کہ بعض امور کو بعض امور سے قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ بعض موارد میں احکام مختلف ہو جاتے ہیں۔ فروض مختلفہ کے اعتبار سے ایک شے میں احکامِ ستر بھی بن سکتے ہیں۔ (بحار، ج ۲، ص ۱۹۷ و ۱۹۸)

۳ جناب کلینی نے اپنی سند کے ساتھ سلیم بن قیس سے روایت کی ہے۔ انھوں نے حضرت امام علی علیہ السلام سے اور حضرت امام علی علیہ السلام نے ایک طویل حدیث بیان کی۔ آپؑ نے فرمایا: حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا امر بھی قرآن کے ناسخ و منسوخ کی مثل ہے۔ عام بھی ہے اور خاص بھی ہے، محکم بھی ہے اور متشابہ بھی ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے جو کلام جاری ہوا تو اُس کے دو چہرے ہیں: کلامِ عام بھی ہے اور کلامِ خاص بھی ہے جیسا کہ قرآنِ مجید ہے۔ (الکافی، ج ۱، ص ۶۴)

۴ محمد بن عیسیٰ سے روایت ہے اُس نے محمد بن عمرو سے، اُس نے عبداللہ بن جندب سے، اُس نے سفیان بن سمط سے، اُس نے کہا: میں نے امام صادق علیہ السلام کے حضور عرض کیا: میں قربان جاؤں، ایک آدمی آپؑ کی طرف سے ہمارے پاس آتا ہے اور ہمیں ایک امرِ عظیم کی خبر دیتا ہے، جس سے ہمارے سینے تنگ ہو جاتے ہیں تو ہم اُسے جھٹلا دیتے ہیں۔

راوی کہتا ہے: امام علیہ السلام نے فرمایا: کیا وہ تمھیں ایسے امور نہیں بتاتا جو ہمیں پسند نہیں ہیں۔

راوی کہتا ہے: میں نے عرض کیا: جی ہاں! وہ آپؑ کی بات بتاتا ہے تو امام علیہ السلام نے فرمایا: کیا وہ رات کے بارے میں کہتا ہے کہ وہ دن ہے اور دن کو رات بتاتا ہے؟

میں نے عرض کیا: ایسا نہیں کہتا۔

آپؑ نے فرمایا: اُسے ہماری طرف پلٹا دو۔ اگر تم اُسے جھٹلاؤ گے تو اس کا جھٹلانا ہمارا جھٹلانا ہوا۔ (بحار، ج ۲، ص ۱۸۷، ۲۱۱ و ۲۱۲)

۵ کچھ اور احادیث بھی ہیں کہ معصومؑ نے فرمایا: ہماری احادیث صعب ہیں، مستصعب ہیں، جن کو کوئی برداشت نہیں کرسکتا سوائے نبی کے یا اس کے وصی کے یا اس فرد کے، جس کے قلب کا اللہ نے امتحان لے لیا ہے۔ یہ احادیث مختلف طریقوں سے بیان ہوئی ہیں جن کے الفاظ آپس میں ملتے جلتے ہیں۔ (بحار، ج ۲)

۶ کچھ احادیث مختلفہ بھی ہیں، جن میں شیعوں سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ جو احادیث ان سے روایت ہوئی ہیں، ان کی تکذیب میں جلدی نہ کرو۔ جب ایک سامع حدیث کا مفہوم نہ سمجھ رہا ہو۔ (بحار، ج ۲، ص ۱۸۶)

۷ کشی نے ابن مسعود سے روایت کی ہے، اُس نے علی بن الحسینؑ سے، اُس نے عباس بن عامر سے اور جعفر بن محمد بن حکیم سے اُس نے ابان بن عثمان سے، اُس نے ابوبصیر سے، اُس نے کہا: حضرت امام صادق علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا گیا: اس وقت میں امامؑ کے دربار میں تھا۔ اُس نے کہا: سالم بن ابی حفصہ نے آپؑ کی طرف سے ایک حدیث بیان کی ہے، جس کی آپؑ نے ستر صورتیں بیان فرمائیں۔

امام علیہ السلام نے فرمایا: سالم میرے کلام سے کیا مراد لیتا ہے کیا وہ چاہتا ہے کہ میں ملائکہ کے ساتھ آؤں۔ اللہ کی قسم! ایسی باتیں قرآن میں موجود ہیں۔ انبیاءؑ نے بھی ان صورتوں کو اپنایا ہے۔ جناب ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: انی سقیم "میں بیمار ہوں" حالانکہ وہ بیمار نہ تھے اور نہ انھوں نے یہ کہہ کر جھوٹ بولا۔

جناب ابراہیم علیہ السلام نے یہ بھی فرمایا: بل فعلہ کبیرھم ھذا "بلکہ یہ ایسا ان میں بڑے بت نے کیا ہو"۔ حالانکہ بڑے بت نے چھوٹے بتوں کو نہیں توڑا تھا اور نہ آپؑ نے جھوٹ کہا تھا۔

جناب یوسف علیہ السلام نے فرمایا: انکم لسارقون "تم سب چور ہو"۔ بخدا! وہ چور نہ تھے اور نہ آپؑ نے جھوٹ کہا تھا۔ (بحار، ج ۲، ص ۲۰۷، ۲۰۹)

علامہ مجلسی نے فرمایا ہے: سالم نے اعتراض اس لیے کیا کہ وہ اس وقت امامت پر یقین نہیں رکھ رہا تھا۔ جب اُسے یقین آیا تو اب اُس پر واجب تھا کہ جو کچھ کلام میں سے معصوم کی طرف سے جاری ہوا اُسے تسلیم کرے۔

تو اس حدیث میں پہلی بات تو یہ ہے۔ امام علیہ السلام نے فرمایا: سالم مجھ سے کیا چاہتا ہے تا کہ اُسے مجھ پر یقین آ جائے؟ اگر وہ اس امر میں براہین و دلائل چاہتا ہے، اور معجزات چاہتا ہے تو وہ یہ سب کچھ دیکھ چکا ہے۔ جو اس امر میں اُس کے لیے کافی ہے۔ اگر وہ یہ چاہتا ہے کہ میرے ساتھ ملائکہ آئیں تا کہ وہ انھیں دیکھے اور ملائکہ اس کے سامنے میری صداقت کی گواہی دیں۔ ایسا تو انبیائے علیہم السلام کے لیے بھی نہیں کیا گیا۔ پھر معصومؑ نے اپنے کلام کے معروضات کی طرف رجوع فرمایا کہ بعض اوقات تقیہ کو پیش نظر رکھا جاتا ہے اور بعض اوقات مصالح کو سامنے رکھا جاتا ہے۔ جھوٹ نہیں ہے بلکہ سچ ہے۔ یہی کچھ انبیائے علیہم السلام سے بھی جاری ہوا۔ (بحار، ج ۲، ص ۲۰۹)

بعد ازیں جو کچھ ابھی بیان ہوا ہے اس پر گفتگو کریں گے۔ درج ذیل وجوہ کے اعتبار سے ہم ان احادیث سے استفادہ کر سکتے ہیں:

① ایک مسئلہ کے مختلف وجوہ اس لیے بیان ہوئے ہیں کیونکہ اس مسئلہ کی قیود متعدد تھیں جو احکام و نتائج کے مختلف ہونے کا سبب تھیں۔

② دوسری بات یہ ہے کہ ہم ان متشابہات کے انکاری نہیں ہیں، جو اہل بیتؑ سے جاری ہوئے۔ اس لیے اس امر کی ضرورت ہے کہ محکمات کی طرف رجوع کیا جائے اور بصیرت کے ساتھ ان کا ملاحظہ کیا جائے۔ جس طرح اوامر عام بھی ہوتے

ہیں اور خاص بھی، ناسخ بھی ہوتے ہیں اور منسوخ بھی۔

③ اہلِ بیتؑ کی احادیث کچھ ایسی بھی ہیں جن کے معانی کی گہرائی تک ہر انسان کو رسائی حاصل نہیں ہو سکتی اس لیے اگر ان کے معانی سمجھ میں نہ آئیں تو ان کے انکار میں جلدی نہیں کرنا چاہیے بلکہ اہلِ بیتؑ کے علوم کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ بلکہ اہلِ بیتؑ کے علوم کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ ایسی تاویل بھی نہیں کرنا چاہیے جو بصیرت سے دُور ہو۔ رہی تاویل کی بات وہ ان شاء اللہ اگلے جلسے میں آنے والی ہے، ان شاء اللہ۔

④ آئمہ اہلِ بیتؑ کے کلام میں کچھ ایسے اشارات پائے جاتے ہیں جن پر خبر صرف اور صرف شیعہ فقہا کو حاصل ہے جنھوں نے اس میدان میں ساری عمر گزاری ہے۔ ان کے مبانی و اصول پر وہ نظر رکھتے ہیں۔ جن لوگوں کو ان کے قواعد و اہداف کا علم نہیں وہ کیسے یہ اوامر حل کر سکتے ہیں جیسا کہ ہر چیز کا اپنا برتن ہوتا ہے، وہ چیز اس میں رکھی جاتی ہے۔ اس طرح امور کے بھی نصاب ہوتے ہیں۔ ان کو اپنے قواعد کے ذریعے حل کیا جا سکتا ہے۔ اسی بنیاد کو سامنے رکھتے ہوئے آئمہ طاہرینؑ نے انھیں فقہا کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

حضرت امام صادق علیہ السلام کی طرف سے روایت ہے، آپؑ نے فرمایا: تم لوگ تمام لوگوں میں ایک بڑا علمی مقام رکھتے ہو کیونکہ تم ہمارے کلام کے عارف ہو۔ (بحار، ج ۲، ص ۱۸۴ و ۱۹۹)

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا: اے میرے بیٹے! آپ شیعوں کی علمی منازل کو ان کی معرفت سے جانو، ان کی معرفت روایت کی درایت ہے۔ یہی چیز مومن کو ایمان کے اعلیٰ درجات تک لے جاتی ہے۔ (بحار، ج ۲، ص ۱۸۴، ۱۹۹)

حضرت امام صادق علیہ السلام کا فرمان: حَدِيثٌ تَدْرِيهِ خَيْرٌ مِنْ أَلْفِ تَرْوِيهِ۔

تم میں سے صرف وہ آدمی ہمارے کلام کے معروضات کا عارف ہو سکتا ہے جو فقیہہ ہوگا۔ (مصدر سابق، ص ۲۰٦)

اس طرح کا ایک اور فرمان بھی ہے، جو چھٹے امام علیہ السلام سے صادر ہے:

خبر تدریه خیر من عشرة ترویه

"ایک حدیث جو درایت پر مبنی ہے وہ دس روایتوں سے بہتر ہے"۔

ان تمام احادیث کی حقیقت موجود ہے اور یہ سب نور ہیں۔ پھر آپؑ نے فرمایا: "بخدا! ہم اپنے شیعوں میں اس کو فقیہہ سمجھتے ہیں، جو ہمارے کلام کی گہرائیوں پر نظر رکھتا ہے"۔

آئمہؑ کے کلام میں بہت زیادہ باریکیاں ہیں، اس لیے عوام کو چاہیے کہ وہ ان کی طرف رجوع کریں جو راسخون فی العلم ہیں تا کہ وہ انھیں ان امور کی مشکلات سے آگاہ کریں۔ راسخون فی العلم صرف اور صرف آئمہ اہلِ بیتؑ ہیں جن کی بارگاہ میں انسان کو سکون واطمینان نصیب ہوتا ہے۔

بسا اوقات آئمہؑ کے بیانات بعض معارض کی وجہ سے موقوف ہوئے ہیں جیسا کہ ہمارے زمانے میں غیبت ہے یا کوئی دوسرے موانع ہیں۔ ان پر ہر وقت درود وسلام ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: وَ سَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا (احزاب:۵٦)

احادیث شریفہ ان امور کی تاکید میں آئی ہیں کہ ان کو اپنے اُوپر لازم کرو۔ (بحار، ج ۲، ص ۱۸۲، ۲۱۲)

تاویل

یہاں تاویل کی ایک اور نوع ہے۔ وہ ہے نتائج و عاقبت کی معرفت جس کی طرف آیت کریمہ اشارہ فرما رہی ہے:

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاْوِيْلَهٗ ؕ يَوْمَ يَاْتِيْ تَاْوِيْلُهٗ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ

نَسُوۡهُ مِنۡ قَبۡلُ قَدۡ جَآءَتۡ رُسُلُ رَبِّنَا بِالۡحَقِّ فَهَلۡ لَّنَا مِنۡ شُفَعَآءَ فَيَشۡفَعُوۡا لَنَاۤ اَوۡ نُرَدُّ فَنَعۡمَلَ غَيۡرَ الَّذِىۡ كُنَّا نَعۡمَلُ‌ ؕ قَدۡ خَسِرُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ وَضَلَّ عَنۡهُمۡ مَّا كَانُوۡا يَفۡتَرُوۡنَ ۝ (اعراف:۵۳)

"کیا یہ لوگ اس کتاب کی (تنبیہوں) کے انجام کار کے منتظر ہیں جس روز وہ انجام کار سامنے آئے گا۔ جو لوگ اس سے پہلے اُسے بھولے ہوئے تھے وہ کہیں گے: ہمارے پروردگار کے پیغمبرؑ حق لے کر آئے تھے۔ کیا ہمارے لیے کچھ سفارشی ہیں جو ہماری شفاعت کریں یا ہمیں (دنیا میں) واپس کردیا جائے تاکہ جو عمل ہم کرتے تھے اس کا غیر (عملِ صالح) بجالائیں۔ یقیناً اُنھوں نے اپنے آپ کو خسارے میں ڈال دیا اور وہ جھوٹ گھڑتے رہتے تھے وہ اُن سے ناپید ہوگئے"۔

⑤ یہ روایات جن پر سوال ہوا ہے تو ان کے بارے یہ عرض کریں گے: پہلی حدیث میں کہا گیا ہے: حدیث تدریه خیر من الف ترویه۔

یہاں مقصود و مطلوب وہ حدیث کی درایت ہے اور اس کے معانی کی معرفت ہے، تاویل کی بات نہیں ہے۔

دوسری حدیث کہ لا یکون منکم فقیها حتی یعرف معاریض کلامنا "تم میں سے کوئی فرد فقیہ نہیں ہے ہاں اُس صورت میں وہ فقیہ ہے جب وہ ہمارے کلام کے معروضات کا عالم ہے"۔

کلام کا معروضات اشارات میں لفظی تاویل نہیں ہے۔ ہاں وہ تاویل مقبول ہوسکتی ہے جو کلام کی تفسیر پیش کردے اور اس کی حقیقت بیان کردے۔ اس لیے فرمایا:

تم اس وقت افقہ الناس ہو، جب تم ہمارے کلام کے عارف ہو۔ مقصد یہ ہے کہ ہمارے کلام کا فہم تمہیں فقیہ بنا دینے کے لیے کافی ہے۔ تاویل کی بات نہیں ہے جیسا کہ بعض لوگوں نے ایسا کہا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو تاویل کا باب کھل جاتا۔

دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ کلمہ شئی کا اطلاق "اللہ تعالیٰ" پر ہوسکتا ہے۔ اس امر کی توضیح احادیث کے آئینہ میں موجود ہے۔

① جناب کلینی نے علی بن ابراہیم سے، انھوں نے محمد بن عیسیٰ سے، اُس نے عبدالرحمٰن بن ابی نجران سے، اُس نے کہا: میں نے حضرت امام محمد باقرؑ سے توحید کے بارے میں سوال کیا۔ میں نے عرض کیا: کیا میں اللہ تعالیٰ کو شئی کہہ سکتا ہوں۔ آپؑ نے فرمایا: جی ہاں! نہ وہ عقل میں سما سکتا ہے اور نہ محدود ہوسکتا ہے، جہاں تیر وہم رسائی حاصل کرسکتا ہے، وہ اُس سے بعید ہے۔ اس کو کسی چیز سے تشبیہ نہیں دی جاسکتی۔ اوہام اس کا اوراک نہیں کرسکتے، اوہام کس طرح اس کا ادراک کریں کیونکہ وہ، وہ نہیں ہے جس کی کنہ تک عقل رسائی حاصل کرے۔ (کافی، ج۱، ص۸۲)

② محمد بن ابی عبداللہ نے محمد بن اسماعیل سے، اُس نے حسین بن حسن سے، اُس نے بکر بن صالح سے، اُس نے حسین بن سعید سے، اُس نے کہا: ابوجعفر ثانی سے جب پوچھا گیا کہ کیا اللہ تعالیٰ کے لیے لفظ شئی کہنا جائز ہے؟

آپ نے فرمایا: جی ہاں وہ دونوں حدوں سے خارج ہے۔ وہ حدیں یہ ہیں: ایک حد تعطیل اور دوسری حد حدِ تشبیہ۔ (کافی، ج۱، ص۸۲)

علامہ مجلسی نے مراۃ العقول میں حدِ تعطیل کی تشریح کی ہے۔ اس کے بالمقابل کسی کا وجود ثابت نہیں۔ اس کی صفات کمالیہ وفعلیہ واضافیہ میں کوئی شریک نہیں۔ حدِ تشبیہ کا معنی ہے حقیقتِ صفات میں اور عوارض ممکنات میں حکم کا شریک ہونا۔

③ علی بن ابراہیم نے اپنے والد سے اُس نے ابن ابی عمیر سے، اُس نے علی

بن عطیہ سے، اُس نے خیثمہ سے، اُس نے حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے پوچھا تو آپؑ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ خلقت سے پاک و پاکیزہ ہے۔ اُس نے سب کو پیدا کیا، ہر وہ جس پر اسم شئی صادق آتا ہے وہ ماسوا اللہ ہے اور وہ مخلوق ہے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے۔ (کافی، ج ۱، ص ۸۳)

اس مضمون پر مشتمل ایک دوسری حدیث ہے جو حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے اور حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے بھی مروی ہے۔ (الکافی، ج ۱، ص ۸۲)

حضرت امام صادق علیہ السلام نے ایک زندیق کے جواب میں فرمایا: جب اُس نے کہا: مَا هُوَ؟ وہ کیا ہے؟ تو آپؑ نے فرمایا: وہ شئی ہے لیکن وہ اشیاء کے خلاف ہے۔ میرے قول کی طرف معنٰی کے اثبات کی طرف رجوع کرو۔ وہ شئی ہے، شیئیت کی حقیقت کے ساتھ۔ نہ تو اس کا جسم ہے اور نہ صورت، اُس کو محسوس نہیں کیا جاسکتا، اس کو حواسِ خمسہ کے ذریعے درک نہیں کیا جاسکتا۔ اوہام اس کا ادراک نہیں کرسکتے۔ زمانہ اس میں نقص پیدا نہیں کرسکتا اور نہ اس میں تبدیلی پیدا کرسکتا ہے۔ (الکافی، ج ۱، ص ۸۳)

دین اور قانون

سوال اہلِ ایمان میں مشہور ہے، دین اسلام ایک سیاسی، اجتماعی، اقتصادی نظام ہے، کیا یہ صحیح ہے کہ دین کے احکام اور موجودہ عالمی حکومتی نظام آپس میں مقرون ہیں؟

جواب امابعد! دین اور قانون کے درمیان ایک بہت بڑا فرق ہے۔ قانون ایک نظامِ عملی ہے، جو لوگوں پر جاری ہوتا ہے۔ اس کا ہدف منافع کا حصول ہوتا ہے اور نقصانات سے بچنا ہوتا ہے۔ بعض لوگ اس سے چھٹکارا پانے کی کوشش کرتے ہیں اور اس میں کامیاب بھی ہوجاتے ہیں لیکن معاملات کے انکشاف پر مواخذہ بھی موجود ہوتا ہے۔

لیکن دین ایمانی حقائق کا نام ہے اور الٰہی تکالیف کا نام ہے۔ دین اسلام کون وحیات کا حقیقی مفہوم ہے، جس میں روحانیت ہے اور زندگی بسر کرنے کے تمام طریقے ہیں۔ دین اسلام کا ہدف یہ ہے کہ انسان کُل کائنات کو مسخر کرے اور اپنے خدا تک جا پہنچے اور یہ بھی ممکن ہے کہ انسان کثرت کے ساتھ وہ ابواب پالے جو اُسے مقرب بنا دیں اور کامیابی و کامرانی کے زینے پر جا پہنچے اور اجر جمیل اور ثواب جزیل کو پالے۔ اللہ تعالٰی نے جو اُس کے لیے تیار کر رکھا ہے۔

دین صرف دوسری زندگی سے مربوط نہیں کرتا یا ان موجودات سے ربط نہیں سکھاتا بلکہ وہ نفسِ انسانی کی تربیت کرتا ہے اور انسانی شخصیت کی تعمیر کرتا ہے اور اس سرچشمۂ ہدایت پر لے جاتا ہے، جہاں انسان کو اپنا پروردگار مل جاتا ہے۔

یہ بات صحیح نہیں ہے کہ دین اسلام صرف ایک سیاسی، معاملاتی یا عبادی نظام ہے وغیرہ بلکہ دین ان تمام سے اعظم اور ارفع ہے۔ اگر دین اسلام صرف نظامِ زندگی ہوتا تو پھر انبیاءؑ کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔ زمانہ ماضی کی بات ہی نہ ہوتی اور نہ انسانی تخلیق کا قصہ سنایا جاتا اور آدمؑ اور ابلیس کے درمیان جو کچھ گزرا یہ بھی نہ ہوتا اور نہ انسان کو اللہ کی عبادت کی دعوت دی جاتی اور نہ تقرب خداوندی کے حصول کی گفتگو ہوتی۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ دین اسلام انسان کو اللہ تک پہنچانے کا ذریعہ ہے، تاکہ وہ درجات حاصل کرے اور قربِ خداوندی کا انعام عظیم پائے۔ اس لیے انسان کو ضرورت ہے ان وسائل کی، جو اس کے لیے مناسبت رکھتے ہیں۔

یہ بات واضح ہے جب انسان ایک مقام اور مرتبہ پر پہنچتا ہے تو وہ اپنے سامنے مختلف مجہولات کو پاتا ہے۔ پھر وہ کوشش کرتا ہے کہ ان مبہمات کو حل کرے تاکہ وہ اس سے زیادہ ہدایات کو اپنائے۔ بعض اوقات اس پر حقائق مختلف فیہ ہو جاتے

ہیں اور وہ قدرت نہیں رکھتا کہ اب ان مراحل کو وہ کس طرح عبور کرے۔ اُسے اُس وقت ہدایات الٰہیہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ پھر اسی انسان کے لیے ہدایات کا عطیہ ہوتا ہے جو اُس کے مناسب حال ہوتا ہے۔

ہر انسان اپنی مناسبت سے ان ہدایاتِ ربانی کا محتاج ہوتا ہے جو ہدایت سلیمانؓ کے لیے ہے اُس ہدایت کی غیر ہے جو ابوذرؓ کے لیے ہے۔

یہی بات ہمیں اس امر کی طرف لے جاتی ہے کہ نبی کی بھی ضرورت ہے اور امام کی بھی ضرورت ہے۔ پس امام صرف خالی معلم اور مبلغ احکام نہیں ہوتا۔ نہ صرف شریعت کا محافظ ہوتا ہے بلکہ امام حیاتِ کلّی اور وجودِ کلّی کا محافظ ہوتا ہے۔

خطبہ البیان

سوال جناب امیرالمومنین علی علیہ السلام کی طرف خطبہ البیان منسوب کیا جاتا ہے کیا یہ ثابت ہے؟ اگر ثابت ہے تو پھر علامہ شریف رضیؒ نے اپنے مجموعہ میں اس کو کیوں شامل نہیں کیا؟ کیا اس خطبہ کی شرح موجود ہے؟

جواب امابعد! جناب نے مجھ سے خطبہ البیان کے بارے میں سوال کیا ہے۔ میں اس خطبہ پر چند سال قبل بحث کر چکا ہوں۔ وہ میری کتاب "دراسۃ علامات الظھور والجزیرۃ الخضراء" میں موجود ہے اور اس طرح ہادی ویب سائٹ پر بھی موجود ہے۔ ان کی ویب سائٹ یہ ہے: www.alhadi.org

خطبہ البیان فی المیزان کے عنوان سے موجود ہے۔ اس خطبہ میں کئی ایک اشکالات موجود ہیں۔ اس میں کئی ایک لغوی اور نحوی غلطیاں ہیں اور اس میں اشتباہات مستعملہ موجود ہیں، تاریخی اشتباہات ہیں۔ اس کی تراکیب بھی درست نہیں ہیں۔ علاوہ ازیں اس کی سند بھی موجود نہیں ہے۔ اس کے علاوہ بھی اس میں کئی ایک سقم ہیں۔

یہ تمام باتیں ہمیں اس امر کی طرف لے جاتی ہیں کہ یہ خطبہ امام امیرالمومنین علیہ السلام نے بیان نہیں فرمایا۔ ہم نے اس بات کا بھی تذکرہ کیا ہے کہ یہ خطبہ یہ نتیجہ دیتا ہے کہ یہ ایسے شخص کی وضع ہے، جو کسی ثقافت کا مالک نہیں ہے اور نہ اُسے لغوی قواعد کی معرفت ہے۔ اگر یہ خطبہ امامؑ کی طرف سے جاری ہوتا تو ضرور اس کا وجود سُنّی یا شیعہ یا زیدیہ یا اسماعیلیہ کتب میں ہوتا۔ ہم نے تمام متقدمین کتب میں اس خطبہ کو کہیں نہیں پایا۔

سیرت علما اور روایات کا اختلاف

سوال آقائے محترم! میں نے علما کے احوال اچھی طرح سے پڑھے ہیں، ان کی سیرت پر لکھی ہوئی کتب کا خوب مطالعہ کیا ہے اور ان کے علمی اخلاقی احوال پر اطلاع حاصل کی ہے۔ قصص علماء سے لے کر علم الرجال تک کی کتب میرے مطالعہ سے گزری ہیں۔ حال ہی میں علامہ تنکابنی کی کتاب قصص العلماء میری نظر سے گزری ہے۔ اس میں مَیں نے السید محمد حسین طہرانی کے حالات پڑھے ہیں مجھے تو اس کتاب میں خرافات ہی نظر آئے۔ اس کتاب میں ہمارے علمائے کبار کے احوال بھی بیان ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر شیخ الاسلام آل کاشف الغطاء کا نام لوں۔ ان کے بارے میں لکھا ہوا ہے، وہ بہت زیادہ کھاتے تھے اور جماع کثرت کے ساتھ کرتے تھے۔ المختصر جو کچھ ان کتب میں موجود ہے وہ ہمارے مراجع عظام کی سیرتوں کے خلاف ہے حالانکہ وہ بزرگوار اپنے زہد و ورع میں معروف تھے۔ اس طرح کے اور خرافات بھی ہیں۔ ابن سینا کے بارے میں بھی بہت کچھ موجود ہے۔ آپ ان کے بارے میں کیا فرمائیں گے؟

جواب میرے برادر محترم! اس امر میں کوئی شک نہیں ہے کہ علمائے کرام کی سیرتوں میں ہمارے لیے بہت سے فوائد ہیں۔ ان صالحین کی سیرت سے ہر انسان اپنی ایمانی شخصیت اور تہذیب اخلاق کی تعمیر کرسکتا ہے۔

اصل بات یہ ہے ان کتب میں جو کچھ موجود ہے، وہ سارا صحیح نہیں ہے کیونکہ بعض نصوص کلی طور پر صحیح نہیں ہیں اس لیے دورانِ مطالعہ ہمارے قلوب میں شک پیدا ہونے لگتا ہے اور ان کی سیرتوں کو تعجب کے ساتھ دیکھتے ہیں۔ اس لیے جو کچھ ان کتب میں موجود ہے وہ صحیح نہیں ہے۔

جہاں تک بات ہے ابن سینا کی، ان کے بارے میں عجیب وغریب داستانیں موجود ہیں۔ جی ہاں ان کے بارے میں یہ بھی کہا گیا ہے اس کا عقیدہ صحیح نہیں تھا۔ اس کا مذہب تشیع بھی نہیں تھا۔ اس لیے جو حدیث شیخ نوری نے نقل کی ہے شاید کہ وہ صحیح ہو۔

آخر میں مَیں آپ کا شکرگزار ہوں۔ خداوند تعالیٰ آپ کی توفیقات میں اضافہ فرمائے اور دینِ مُبین کی خدمت کی توفیق دے۔

نظامِ زندگی اور اُس کے سلبیات

سوال ① نظامِ زندگی میں قوانین الٰہی کا کیا مقصد ہے؟

② کیا ان قوانین کے سلبیات بھی ہیں؟

③ ان کے بارے میں انسانی موقف کیا ہے؟

④ کیا یہ صحیح ہے کہ انسان اپنی فطرت کی رہبری میں زندگی بسر کرتا ہے؟

جواب امابعد! ① قوانینِ الٰہی ہی تعمیرِ حیات کی بنیاد ہیں۔ انھی قوانین کے بل بوتے پر انسان نے ترقی کی ہے اور پھلا پھولا ہے۔ جو چاہا اور جو پسند کیا، اُسے

حاصل کیا۔ اگر یہ قوانین نہ ہوتے تو حیات انسانی ویران ہو کر رہ جاتی۔ نہ تو وہ نشوونما پاتی اور نہ وہ مستقبل کی منصوبہ بندیاں کرسکتا اور نہ اپنی آنے والی نسلوں کی تعمیر کرسکتا، نہ یہ کھیتی باڑی کا نظام ہوتا اور نہ تجارت کی سرگرمیاں ہوتیں اور نہ وہ ایجادات کرسکتا اور نہ تعلیم و تعلم کا نظام ہوتا۔ اسی طرح نہ حیات ہوتی، نہ انسان ہوتا اور نہ یہ کون و مکان ہوتے۔

۲ دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ ان قوانین کے سلبیات کی طرف جو اشارہ کیا گیا ہے، جن کو انسان سلبیات خیال کرتا ہے درحقیقت وہ سلبیات نہیں ہیں۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ انسان اپنی ذات کے مفاد کے لیے کچھ پسند کرتا ہے لیکن وہ اُسے میسر نہیں آتا تو وہ سمجھنے لگتا ہے کہ اس کا نقصان ہوا ہے۔ حالانکہ حقیقت میں اس کا نقصان اگر ہوا ہوتا تو وہ عارضی ہوتا ہے، جو اس کی سوچ سمجھ سے بالا ہوتا ہے۔

مثال کے طور پر جب موسلا دھار بارش آتی ہے اور بہت زیادہ آتی ہے تو یہ بارش اس کے بہت سے اُمور کو فاسد کردیتی ہے اور یہ آدمی اپنے امور میں اس فساد کو پسند نہیں کرتا تو وہ یہ خیال کرتا ہے کہ اس کا نقصان ہوگیا ہے حالانکہ ایسی بات نہیں۔

اس طرح جب رات کی سیاہی ہر سُو چھا جاتی ہے تو وہ خوف زدہ ہوجاتا ہے کہ کہیں اس کے لیے ایسے عوامل پیدا نہ ہوجائیں، جن کو وہ پسند نہیں کرتا۔ جب گرمی کا زمانہ آتا ہے تو اس کی گرمی اسے اذیت دیتی ہے۔ وہ پریشان ہونے لگتا ہے کیونکہ اُس نے دن کے وسطی حصے میں بہت سے کام کرنا ہوتے ہیں۔

اگر کوئی یہ کہے کہ ان سلبیات سے بشری زندگی متاثر ہوتی ہے اور نظام کون و مکان میں خلل واقع ہوتا ہے تو ان کی یہ رائے نہ معقول ہے اور نہ مقبول ہے، بلکہ یہ اوہام اور تخیلات ہیں۔ ان سلبیات کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اس کائنات میں جو عوارض پیدا ہوتے ہیں تو بعض اوقات کچھ انسانوں کا ظاہری اور عارضی نقصان ہوتا

ہے تو دوسرے انسانوں کا فائدہ ہوتا ہے۔ یا یہ بھی ہے کہ بعض اوقات انسان ایک چیز کے حصول کو اپنے لیے فائدہ جانتا ہے تو حقیقت میں نقصان ہوتا ہے اور بعض اوقات کسی چیز کے چلے جانے پر انسان اپنا نقصان خیال کرتا ہے۔ حقیقت میں اس کا فائدہ ہوتا ہے۔

اسی کیفیت کی طرف قرآن مجید میں آیت موجود ہے:

وَ عَسٰٓى اَنۡ تَكۡرَهُوۡا شَيۡـــًٔا وَّهُوَ خَيۡرٌ لَّـكُمۡ‌ۚ وَعَسٰۤى اَنۡ تُحِبُّوۡا شَيۡـــًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّـكُمۡ‌ؕ (البقرہ:۲۱۶)

"شاید کہ جس چیز کو تم پسند نہیں کرتے وہ تمہارے لیے بہتر ہو اور جس چیز کو تم ناپسند کرتے ہو، وہ تمہارے لیے بہتر نہ ہو"۔

۳ تیسرے سوال کا جواب یہ ہے: انسان کائنات میں تصرف کرتا ہے۔ نوامیس فطرت سے استفادہ کرتا ہے لیکن کچھ شرائط کے ساتھ۔ اس کے تصرف کے لیے کچھ ضوابط ہیں۔ اگر ان ضوابط کا خیال رکھے گا تو اس میں اس کے لیے بھی بھلائی ہے اور پورے معاشرہ انسانی کے لیے بھی بھلائی ہے۔ اگر وہ ان ضوابط سے ہٹ کر اپنی زندگی کی گاڑی چلائے گا تو پھر معاشرے میں اتنے نقص پیدا ہوں گے جن کا ازالہ مشکل ہو جاتا ہے۔

اس لیے انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ فطرت کے اصولوں پر چلے اور صحیح راستوں کو اپنائے۔ اور وہ راستے جن کو خالق کون ومکان نے مرتب فرمایا ہے۔ خالق کون ومکان نے انسان کے لیے جو جو قوانین بنائے ہیں، ان تمام قوانین میں اس کے لیے فائدے ہی فائدے ہیں۔

جب انسان اپنے خالق کے وضع کردہ طریقوں کو اپنائے گا تو اُسے وہ ثمرات حاصل ہوں گے، جن کے لیے اُس کی تخلیق کی گئی ہے۔ اسی تخلیق کا مقصد سیرت کامل

ہے جو اُسے ان اہداف تک پہنچادے گی جو اہداف اس کے لیے مقرر ہوئے ہیں۔

جی ہاں! اگر انسان نے صحیح راستوں کو نہ اپنایا تو وہ کبھی بھی ان اہداف تک نہیں پہنچ سکتا۔ پھر نتیجہ جو سامنے آئے گا، وہ خسارہ ہی خسارہ ہوگا۔

مزید وضاحت کے لیے یہ عرض کریں گے: دین اسلام حقائق واقعیہ کا نام ہے اور اسلام کی کوشش اور اس کا پیغام بھی ہے کہ انسان حقائق کو اپنائے اور ان پر عمل کرے۔

جب ہم اس کائنات کا مطالعہ کرتے ہیں تو واضح طور پر ہمیں معلوم ہوجاتا ہے کہ اس کائنات کا نظام اس صورت میں منظم ہے کہ ہر انسان کو خطا وصواب کا علم ہوجاتا ہے۔ اس صورت میں فطرت اور تربیت اُسے اس راستے پر چلانے کی کوشش کرتی ہے جو راستہ صحیح ہے۔

ہم اپنے موقف کو سمجھانے کے لیے ایک گھر کی مثال دیتے ہیں۔ جب انسان اپنے لیے ایک گھر بناتا ہے تو اس گھر کے احاطہ میں ہر اس چیز کو رکھتا ہے، جو اُس کے لیے مفید ہوتی ہے۔ اس کے لیے ہر سعادت وخیر جو اُس کے لیے مفید ہوتی ہے، جمع ہوجاتی ہے، چاہے وہ گھر میدان میں ہو یا پہاڑ میں، پہاڑ کی چوٹی پر ہو یا زمین کی پستی پر، نرم زمین پر ہو یا سخت زمین پر ہو۔

تو اس انسان پر اس گھر کا تمام ماحول اور اس گھر کے اردگرد کا تمام ماحول اثر کرتا ہے۔ اس ماحول سے اس کی روح، اس کا مزاج، اس کا نفس متاثر ہوتے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس گھر میں جو افراد رہتے ہیں، وہ ان سے بھی اثر لیتا ہے، چاہے والدین ہوں یا اولاد، بیوی ہو یا بھائی، جو بھی ہو اُس سے متاثر ہوتا رہتا ہے۔

اگر کوئی دوسرا آدمی جو ایک تنگ وتاریک اور چھوٹے سے گھر میں رہ رہا ہے جس کی گلیاں تنگ ہیں جو پُرہجوم شہر کے محلات میں رہ رہا ہے، جو غیر منظم ہے اور

جہاں ثقافت نام کی کوئی چیز نہیں تو وہ بھی اس کے ماحول اور گھر کے ماحول سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اب وہ یہ فیصلہ کرتا ہے کہ وہ بھی اپنی اولاد اور گھر والوں کے ساتھ اس طرح سے جس طرح وہ پہلے گھر والا رہ رہا ہے۔ اس طرح جب ایک انسان اپنی زندگی کو ان راہوں پر ڈالتا ہے، جو راہیں اُسے اپنے رب اور خالق کے قریب کرتی ہیں تو اس وقت اس کی روح اور اس کا شعور اس آدمی سے مختلف ہوتا ہے، جو ان حقیقی راہوں کا مسافر نہیں ہوتا۔

اس طرح اگر ہم ارادہ کرلیں کہ ہم وہ زندگی بسر کریں جس زندگی کے بارے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا اس کے وصی نے حکم دیا ہے تو ہم اپنے اللہ کے قریب پہنچ سکتے ہیں۔ تو ہمیں پہلی حالت میسر آجائے گی۔ وہاں آرام بھی ہوگا، سکون بھی ہوگا اور سعادت کے تمام خزانے بھی حاصل ہوں گے اور ہر قسم کے مصائب سے حفاظت کا نظام بھی حاصل ہوگا۔

مقبول ومشکور نصیحت

سوال محترم برادر عزیز! آپ نے محترم السید فضل اللہ کے بارے میں فرمایا ہے کہ وہ خطا پر ہیں لیکن اس زمانے میں ہم پر واجب بنتا ہے کہ ہم ان قضایا کو ترک کردیں، جن سے اہل تشیع کی صف میں انتشار پیدا ہوتا ہے۔

میں جناب کی توجہ اس امر کی طرف مبذول کرتا ہوں کہ اس وقت اسلام کے دشمن اسلام پر جنگ مسلط کیے ہوئے ہیں۔

جواب امابعد! میرے برادر محترم! جو کچھ آپ نے فرمایا ہے یہی میرے دل کی آواز ہے لیکن ہم کیا کریں۔ اس وقت السید محمد حسین فضل اللہ نے جس بحث کو چھیڑا ہے اُس سے عوام الناس کے اعتقادات میں خلل پڑا ہے اور فقہائے عظام بھی

مضطرب ہوئے ہیں۔

میرے محترم بھائی! خوش آمدید! آپ سید فضل اللہ صاحب سے مطالبہ کریں کہ وہ ان بحثوں کو چھوڑ دیں کیونکہ ان بحثوں سے وہ اعداء اسلام کی خدمت کر رہے ہیں۔

میرے محترم بھائی! میں آپ کا شکرگزار ہوں کہ آپ نے دین و ایمان کے قضایا کی حفاظت کا کام کیا ہے اور آپ نے کوشش کی کہ اہلِ ایمان کی وحدت محفوظ اور مضبوط ہو۔

میں خداوند تعالیٰ کے حضور دعا کرتا ہوں کہ ہم سب کو حُبِ اہلِ بیتؑ کے کلمہ پر جمع فرمائے اور ان کی سیرت کو اپنانے کی توفیق عطا فرمائے اور جس دن مال و اولاد نفع نہ دیں گے، اُس دن انھیں ہمارا شافعی قرار دے اور ہمیں تکلیفِ شرعی کی معرفت عطا کرے اور لوگوں کی ہدایت کی مسئولیت سے آگاہی دے اور عوام الناس سے شبہات کو دُور کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

شیعہ اور سُنّی

سوال ۱ دو لفظ شیعہ اور سُنّی جن کا ذکر منبر پر بہت زیادہ ہوتا ہے۔ اکثر کتب میں بھی دونوں الفاظ کا استعمال کثرت کے ساتھ ہوا ہے۔ کہا گیا ہے کہ یہ دونوں لفظ اصطلاحات ہیں جو رسول اللہ ﷺ کے زمانے کے بعد وجود میں آئیں۔ آپؐ کے زمانے میں نہ شیعہ تھے اور نہ سُنّی۔ یہ اختلاف اُمت رسولؐ کے بعد ہوا اور خلافت کے زمانے کی یہ پیداوار ہیں:

ا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ کیا یہ رائے صحیح ہے؟

ب۔ کیا لفظ شیعہ بھی رسولؐ اللہ کے بعد وجود میں آیا؟ حالانکہ

احادیث میں جو اہلِ بیتؑ کے طریقے سے ہم تک پہنچی ہیں ان میں لفظ شیعہ موجود ہے اور الفاظ شیعۃ علی موجود ہیں۔

ج- کیا ایسی احادیث جن میں لفظ شیعہ موجود ہے اہلِ سنت کے طریقے سے بھی صادر ہے؟

د- اہلِ سنت والجماعت کے الفاظ کب وجود میں آئے انھوں نے اپنے مذہب کے لیے یہ الفاظ کیوں استعمال کیے؟

ر- بعض اہلِ سنت شیعوں پر الزام دیتے ہیں اہلِ کوفہ حضرت امام حسین علیہ السلام کے شیعہ تھے۔ انھوں نے حضرت امام حسین علیہ السلام کو شہید کیا۔

◇ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ شیعوں نے نہ صرف حضرت امام حسین علیہ السلام کو دھوکہ دیا اور ان کی نصرت نہ کی بلکہ انھوں نے حضرت امام حسین علیہ السلام کے پاک خون سے اپنے ہاتھوں کو رنگین کیا۔ جس طرح یزید لعین اور اس کا لشکر قتلِ امام میں شریک ہے۔ اس طرح شیعیانِ کوفہ بھی شریک ہیں۔ جس طرح قتلِ امامؑ کی ذمہ داری اُمویوں اور یزید پر پڑتی ہے، اسی طرح شیعیانِ کوفہ پر بھی پڑتی ہے؟

◇ دعائے توسل ایک معروف دعا ہے، جس کا مضمون شرک پر مبنی ہے کیونکہ اس دعا کے الفاظ کے ذریعے انسان غیر اللہ سے طلب کرتا ہے۔ یہاں تو قصدِ رجاء بھی جائز نہیں ہے۔ ہمارے علمائے کرام نے ایسی دعاؤں کو اپنی کتب میں کیوں شامل کیا ہے؟ اور وہ اس امر کی طرف کیوں متوجہ نہیں ہوتے؟

جواب امابعد! آپ کے پہلے سوال کا جواب یہ ہے:

(۱) کلمہ شیعہ رسول اللہ ﷺ کی مبارک زبان پر جاری ہوا۔ آپؐ نے کئی ایک مقامات پر اس کلمہ کو استعمال کیا۔ رسولؐ اللہ کی حدیث ہے:

ان علیًا وشیعته هم الفائزون

"علیؑ اور اس کے شیعہ ہی کامیاب ہیں"۔

یہ حدیث سُنّی اور شیعہ کتب میں برابر موجود ہے۔ اب بات رہی لفظ "السنۃ" کی تو یہ بھی پیغمبر ﷺ سے وارد ہے۔ جو لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ "اہلِ سنت" کی اصطلاح حضرت امام حسنؑ اور معاویہ کی صلح کے بعد وجود میں آئی ان کا یہ خیال حقیقت پر مبنی نہیں ہے۔ تحقیق یہ ہے کہ یہ کلمہ پیغمبر اکرم ﷺ سے صادر ہے۔

(۲) دوسرے سوال کا جواب کہ کوفہ کے شیعوں نے حضرت امام حسین علیہ السلام کو شہید کیا تھا تو اس سوال کا جواب یہ ہے:

ا۔ حضرت امام حسین علیہ السلام نے اس لشکر کی تعریف خود اپنی زبان پر جاری فرمائی تھی جو لشکر آپؑ کے ساتھ کربلا میں جنگ کرنے کے لیے آیا تھا۔ آپؑ نے فرمایا تھا:

یہ لوگ آلِ ابوسفیان کے شیعہ ہیں۔

ب۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہم نے اسی بات کو اپنی کتاب "علیؑ والخوارج" میں ثابت کیا ہے کہ اس زمانے میں اہلِ عراق شیعہ نہیں تھے۔ اہلِ عراق کو اہلِ بیتؑ کا تعارف اُس زمانے میں ہوا تھا جس زمانے میں حضرت امام علی علیہ السلام نے کوفہ کو اپنا وطن بنایا تھا لیکن حضرت امام علی علیہ السلام کی شہادت کے بعد حالات نے پلٹا کھایا اور معاویہ کو ہر طرف غلبہ حاصل ہو گیا اور اُس کے حکومتی کارندوں نے حضرت امام علی علیہ السلام کے شیعوں کا پیچھا کیا اور انھیں جہاں کہیں پایا انھیں مصائب سے دوچار کر دیا اور ان پر اللہ کی زمین تنگ کر دی۔ آخرکار کربلا کا قیام ہوا۔

③ آپ کے تیسرے سوال کا جواب یہ ہے: علمائے کرام نے اس دعائے توسّل کی اجازت دی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَ ابْتَغُوْٓا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ (المائدہ:۳۵)

"اس کی طرف وسیلہ تلاش کرو"۔

ایک روایت میں آیا ہے حضرت امام علی علیہ السلام نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا: "میں ہی اُس ذات تک وسیلہ ہوں"۔ (تفسیر البرہان، ج ا، ص ۴۶۹)

علی بن ابراہیم سے روایت ہے کہ جب اس آیت کی تفسیر کے متعلق سوال ہوا تو کہا: اللہ تک پہنچنے کے لیے اپنے امام کا تقرب حاصل کرو۔ (تفسیر برہان، ج ا، ص ۴۶۹)

حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے، آپؐ نے آئمہ اہلِ بیتؑ کے حوالے سے فرمایا: امام حسین علیہ السلام کی اولاد سے ہوں گے اور وہ سب عروۃ الوثقیٰ ہیں اور اللہ تک پہنچنے کا وسیلہ ہیں۔ (تفسیر نورالثقلین، ج ا، ص ۵۲۰)

اہلِ سنت کی کتب حدیث میں روایت موجود ہے جس کے راوی عثمان بن حنیف ہیں۔ ایک آدمی جس کا نام ضریر تھا بارگاہِ رسالتؐ میں آیا اور عرض کیا: آپؐ اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائیں کہ وہ مجھے معاف کردے تو اُس وقت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اگر تو چاہے تو میں دعا کرتا ہوں اگر تو صبر کرنا پسند کرے تو وہ تیرے لیے بہتر ہے۔ تو اُس نے کہا: آپؐ دعا فرمائیں۔

پس آپؐ نے اُسے وضو کرنے کا حکم دیا اور فرمایا: دو رکعت نماز پڑھ اور یہ دعا مانگ:

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ وَاَتَوَجَّهُ اِلَيْكَ بِنَبِيِّكَ مُحَمَّدٍ نَبِيِّ الرَّحْمَةِ، يَامُحَمَّدُ، اِنِّیْ اَتَوَجَّهُ بِكَ اِلٰى رَبِّیْ فِیْ حَاجَتِیْ لِتَقْضِیَ اَللّٰهُمَّ اشْفَعْهُ فِیَّ (تفسیر نورالثقلین، ج ا، ص ۵۱۹)

"اے معبود! میں تجھ سے سوال کرتا ہوں اور تیری طرف متوجہ ہوتا ہوں تیرے پیغمبرؐ نبی رحمت حضرت محمد ﷺ کے وسیلے سے، اے محمدؐ! میں آپ کی طرف متوجہ ہوں آپ کو بارگاہِ الٰہی میں اپنا سفارشی اور اپنا وسیلہ بناتا ہوں اور اپنی حاجت آپؐ کے سامنے پیش کرتا ہوں تاکہ میری حاجت پوری ہو، اے میرے اللہ! انھیں میرا شافعی قرار دے"۔

اپنی گذشتہ بات کو آگے بڑھاتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا فرمان پیش کرتا ہوں:

وَ لَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا

"اور جب یہ لوگ اپنے آپ پر ظلم کر بیٹھتے تھے تو اگر آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر اللہ سے معافی مانگتے اور رسولؐ بھی ان کے لیے مغفرت کی دعا کرتے تو وہ اللہ کو توبہ قبول کرنے والا رحم کرنے والا پائے گا"۔ (النساء:۶۴)

یہ امر تمام لوگ اچھی طرح سے جانتے ہیں، مسلمانوں میں سے کسی نے اس کا انکار نہیں کیا۔

علامہ مجلسی نے فرمایا ہے کہ ایک روایت میں ہے کہ لوگوں کا جم غفیر تھا۔ ہمارے علما میں سے شاذان بن جبرئیل بھی تھے اور مخالفین میں سے اسعد بن ابراہیم اردبیلی مالکی تھے۔ عمار بن یاسرؓ اور زید بن ارقمؓ کے حوالے سے یہ حدیث بیان کی ان دونوں بزرگواروں نے فرمایا: ہم حضرت امام علی علیہ السلام کی بارگاہ میں تھے"۔

دعائے توسل کی مشروعیت پر تاریخ وحدیث کے اعتبار سے کثرت کے ساتھ دلائل موجود ہیں۔

علامہ شیخ علی احمدی نے اپنی کتاب "التبرک" میں بہت سے شواہد جمع کیے ہیں۔ مزید تحقیق کے لیے رجوع کر سکتے ہیں۔

انبیائے علیہم السلام اور اولیائے کرام سے توسّل کرنا شرک نہیں ہے۔ جب توسّل نبی یا ولی سے کیا جاتا ہے تو اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان کے ذریعے خداوند تعالٰی ان کی حوائج پوری کرے۔ انسان انھیں وسیلہ بناتا ہے اور خداوند تعالٰی سے سوال کرتا ہے اس لیے یہ شرک نہیں ہے۔ اور یہ نیک لوگ جانتے تھے کہ خداوند تعالٰی ان کی دعاؤں کو رد نہیں فرماتا۔ خداوند بھی چاہتا ہے کہ اس کے بندے انھیں میری ذات کے لیے وسیلہ بنائیں اور یہ وسیلہ بنانے والے یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ آئمہ اہلِ بیتؑ کے پاس جو طاقت ہے وہ اللہ تعالٰی کی طرف سے ہے۔

کیا وہ احول تھا؟

سوال سب سے پہلے تو آپ کی خیریت چاہتا ہوں۔ میں نے اُس کے بارے ایک کتاب میں پڑھا تھا کہ وہ بھینگا تھا۔ کیا واقعی وہ بھینگا تھا۔ اگر ایسی روایت ہے تو اس کا مصدر بتائیں۔

جواب امابعد! آپ نے جس فرد کے بارے میں سوال کیا ہے اس کے بارے میں ذہبی نے کہا ہے کہ وہ احول تھا۔ آپ کتاب دُول الاسلام (ص ۱۰، ۱۱) اور تاریخ خمیس (ج ۲، ص ۳۴۰) میں ملاحظہ کر سکتے ہیں۔

اصولِ دین کی معرفت کا ضابطہ

سوال جناب سماحت المعظم آیت اللہ السید جعفر مرتضٰی عاملی دعا و سلام کے بعد آپ کے حضور عرض ہے کہ اس وقت بازار میں کوئی ایسی کتاب میسر نہیں، جس میں اصولِ دین اور فروعات

کے کلیات موجود ہوں۔ ہمیں اپنے مذہب کے ان بنیادی احکام کی تفصیلات کی ضرورت ہے۔ موجود ماحول پر آپ کی خوب نظر ہے کہ ہر طرف گمراہ کرنے والوں کا زور بھی ہے اور شور بھی ہے۔ اس لیے ایک ایسی کتاب کی ضرورت ہے، جس میں دین کے اصولوں کی تشریح موجود ہو تاکہ ہم ایسے لوگ انحرافات سے محفوظ ہو جائیں اور عوام الناس کا بھی فائدہ ہو۔

ہمیں اس بات کا بھی پوری طرح احساس ہے آپ ایک مصروف ترین شخصیت ہیں لیکن ہمارے اس مسئلہ کا حل بھی جناب کے پاس ہے۔ آپ کی ذات والاصفات سے اُمید ہے آپ ہماری اس مشکل کو حل فرمائیں گے۔

جواب امابعد! میں جناب کا شکرگزار ہوں۔ جناب نے ان مسائل کی نشاندہی فرمائی ہے جن سے معاشرے میں انتشار پیدا ہو رہا ہے۔ خداوند تعالیٰ سے دعا ہے کہ سب کو ہدایت عطا فرمائے۔ جس امر کی آپ نے نشاندہی کی ہے تو اس بارے میں صاحب روضات الجنات کی کتاب "الفطریہ" موجود ہے۔ جس میں اس موضوع پر بحث کی گئی ہے لیکن تفصیل کے ساتھ نہیں ہے۔ پھر ایک دوسری کتاب ان کی طرف سے نشر ہوئی وہ پوری تفصیل کے ساتھ ہے۔

ہم نے علامہ الشیخ ابراہیم الابصاری کے سامنے یہی موضوع رکھا تھا تاکہ یہ موضوع پوری تفصیل وتوضیح کے ساتھ کتابی شکل میں آئے۔ میرا خیال ہے انھوں نے اس موضوع پر مفصل بحث پیش کی ہے۔

O......OOO......O

آخری کلمات

مجھے امید ہے قاری کریم کو میری اس کتاب میں سوالات کے جوابات مطمئن کریں گے۔ شاید ہمارے قاری کو اس بات کی شکایت ہو کہ جوابات تفصیلات کے ساتھ کیوں نہیں ہیں۔

اصل بات یہ ہے یہ کتاب تفصیلات کی متحمل نہیں ہے۔ ہاں مجھے اس امر کا اعتراف ہے کچھ ایسے سوالات آئے ہیں جن کے جوابات کو شافی اور کافی بنانے کی کوشش کی گئی ہے لیکن جو حق تھا شاید کہ وہ ادا نہ ہوا ہو۔

ہمیں اپنے قاری کریم سے اُمید ہے جہاں کہیں اُسے کوئی سقم نظر آئے تو وہ ضروری نشاندہی فرمائیں گے کیونکہ ہم معصوم عن الخطا نہیں ہیں۔ کوشش تو ہوتی ہے کہ حق وحقیقت کی ترویج ہو۔

ہمیں بھی ضرورت ہے ان دعاؤں کی جو ہر قسم کی لغزشوں سے محفوظ رکھتی ہیں، کیونکہ صالحین کی دعاؤں میں ایک عظیم اثر ہے۔

ہمیں اپنے قاری پر اُمید ہے، وہ ہمیں ضرور اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں گے۔ یہ ان کا بندہ پر احسان عظیم ہوگا۔ ہم اپنے پروردگار سے دعا کرتے ہیں کہ وہ اپنی تمام نعمات سے ہمیں ہمیشہ نوازتا رہے۔ اپنے فیوض وبرکات سے محروم نہ رکھے۔ کیونکہ وہ قادر مطلق ہے اور ہمارا آقا ومولیٰ ہے۔

والحمد لِلّٰه والصلوٰۃ والسلام علی محمد وآلہ الطاھرین

السید جعفر مرتضیٰ العاملی، لبنان